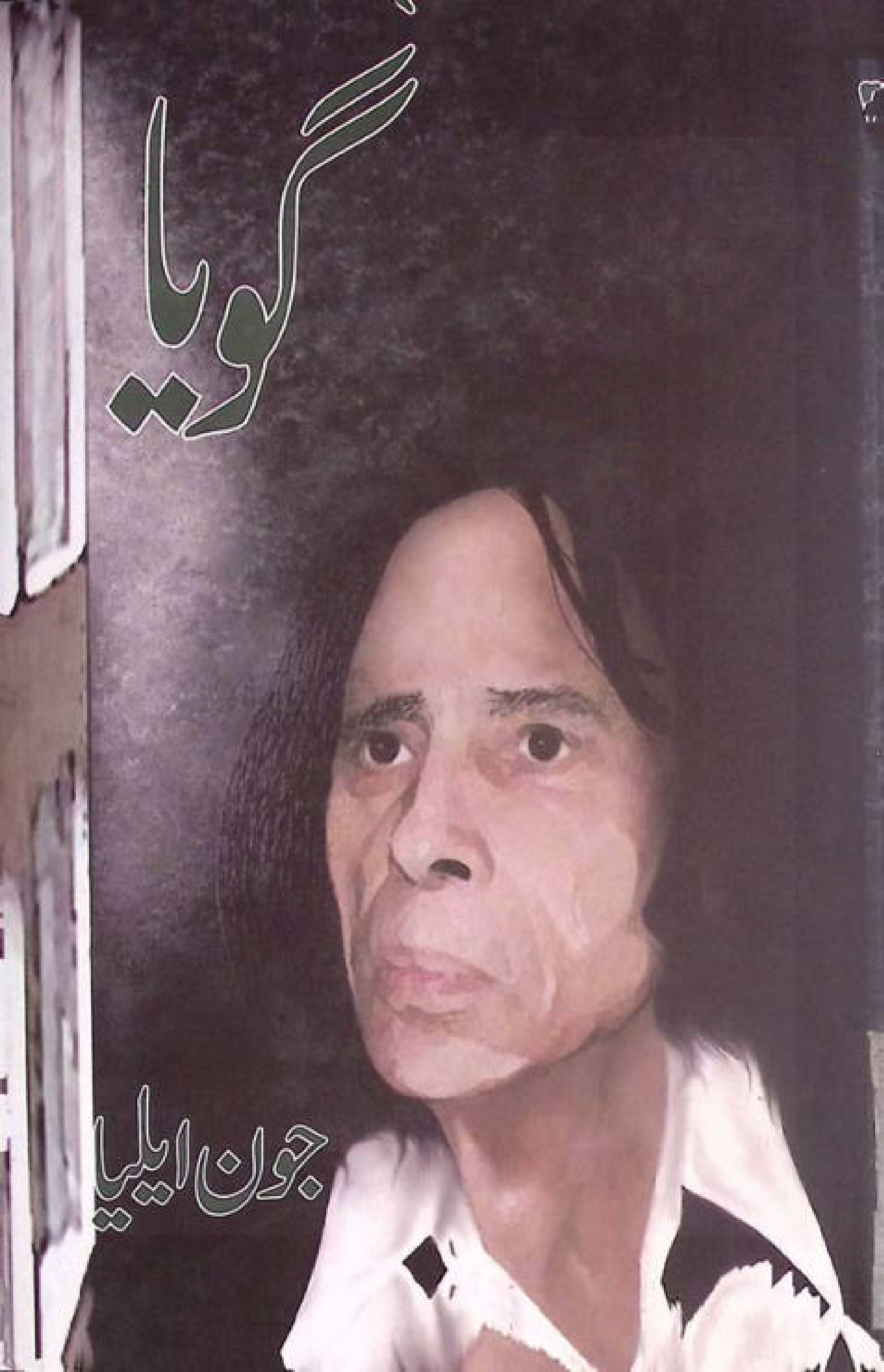

گویا
جون ایلیا

بسم الله الرحمن الرحیم

گویا

کہتے ہیں جس کو ذات وہ گویا کہیں نہیں
دنیا میں دیکھ آئے، یہ دروا کہیں نہیں

گویا

جون ایلیا

الحمد پبلی کیشنز

رانا چیمبرز۔ سیکنڈ فلور۔ (چوک پرانی انار کلی)۔ لیک روڈ۔ لاہور
☎ 37231490 - 37310944

ھماری کتابیں .....

خُوبصورت، معیاری اور

کم قیمت کتابیں

تزئین و اہتمام اشاعت

صفدر حسین

alhamd_publication@yahoo.com

ضابطہ:-

مرتب : خالد احمد انصاری

سرورق : خالد احمد انصاری

اشاعت سوم : 2014ء

مطبع : حاجی حنیف پرنٹرز لاہور

تعداد : ایک ہزار

قیمت : 300 روپے

انتساب

جونؔ ایلیا کے ''محرم'' دوست

معروف شاعر

سیّد حسن عابد مرحوم

کے نام

اِشاریہ

”جانے کیا ہو“......!

جونؔ ایلیا کا پانچواں مجموعۂ کلام ''گویا'' نذرِ قارئین ہے۔ جونؔ ایلیا کی شاعرانہ عظمت کو اُن کی زندگی میں ہی تسلیم کر لیا گیا تھا مگر اُن کے کلام کی بروقت اشاعت نہ ہونے کی وجہ سے اُن کے کلام کے بارے میں مختلف اندازے اور تخمینے لگائے جاتے رہے۔ بعد ازاں' جیسے جیسے اُن کے مجموعہ ہائے کلام منظرِ عام پر آتے گئے انہوں نے اُن کے کلام سے منسوب وہ تمام دعوے دُرست ثابت کر دیے جو اُس سے متعلق کیے جاتے رہے تھے اور اُن کی شاعری کو مزید وسیع تناظر میں دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

''گویا'' جونؔ ایلیا کے شعری مجموعوں میں ایک اہم اضافہ ہے۔ ''گویا'' اپنے انداز و فکر کے الگ ہی رنگ لیے ''دبستانِ جونؔ'' کو واضح طور پر سامنے لایا ہے۔ یہ مجموعہ اس تاثر کی نہ صرف نفی کرتا ہے جس کے مطابق جونؔ ایلیا کا اہم کلام شائع ہو چکا ہے بلکہ اس تاثر کو تقویت پہنچانے کا باعث ہو گا کہ جونؔ ایلیا کا صرف وہ ہی کلام اہم نہیں تھا جو کہ اُن کی مشاعروں کی ضرورت بن گیا تھا۔

''گویا'' جونؔ ایلیا کی ہلاکت خیز غزلوں اور نظموں کا ایسا امتزاج ہے جو اس سے قبل اُن کے کسی مجموعہ میں دیکھنے میں نہیں آیا اور جس کی توقع شاید اُن کے بے حد قریبی لوگ بھی نہ کر رہے ہوں۔ اُس کی وجہ جونؔ ایلیا کا وہ کلام ہے جو میری جستجو اور اُن کے عاشقوں کی والہانہ عقیدت کے نتیجہ میں دستیاب ہوا۔ اُس کلام نے میرے پاس موجود کلام کو وہ قوت بخشی جو اُن کے کلام کی اصل رُوح ہے' جسے سامنے رکھ کر میں نے اس مجموعہ کو ترتیب دیا ہے۔

جونؔ ایلیا کے رجسٹروں سے شروع ہونے والا یہ سلسلہ اب ایک تحقیقی شکل اختیار کر چکا ہے۔ ایسے لوگ جو کہ جونؔ ایلیا کی زندگی میں اُن سے منسلک ہو کر محبت کرتے رہے' آج بھی اُن سے اتنی ہی محبت کرتے ہیں۔ جونؔ ایلیا کے ایسے ہی کچھ عاشقوں نے اُن کے مجموعوں کے سلسلے میں کی گئی میری کوششوں کو سراہتے ہوئے جونؔ ایلیا کا جو کچھ کلام اُن کے پاس موجود تھا مجھے مہیا کیا تا کہ میں زیادہ احسن طریقے سے اپنی ذمہ داری کو ادا کر سکوں۔ جس میں پیش پیش جونؔ ایلیا کے بھتیجے علامہ علی کرار نقوی صاحب تھے۔ علامہ صاحب اِس سے قبل بھی اُن کے مجموعہ کے لیے کلام دے چکے ہیں اور حسبِ وعدہ اس مرتبہ بھی انہوں نے مجھے یہ کہہ رکھا تھا کہ اُن کے کتب خانے میں جونؔ ایلیا سے متعلق کوئی بھی ایسی چیز موجود ہو جسے شائع کیا جا سکے' اُن کے مجموعہ کے لیے حاضر ہے۔ علامہ علی کرار نقوی صاحب کے جونؔ ایلیا سے دائمی رشتے کو میں قابلِ قدر سمجھتا ہوں اور آئندہ جونؔ ایلیا کی سوانح عمری "یادگار جونؔ ایلیا" میں اُن کی جونؔ ایلیا کے لیے خدمات کے حوالے سے مفصل طور پر تحریر کروں گا۔

مرحوم دوست جاوید معنیؔ کے بڑے بھائی شیخ محمد ولی اور بھابھی اسماء ولی نے بھی جونؔ ایلیا سے اپنی محبت اور عقیدت کا رشتہ خوب نبھایا۔ اُن کے پاس جونؔ ایلیا کے کلام کا وہ حصہ محفوظ تھا جو اُس وقت کی یادگار ہے جب جونؔ ایلیا اُن کے گھر قیام کیا کرتے تھے اور ہم سب مل کر اُن کے مجموعوں کے لیے کام کر رہے تھے۔ جونؔ ایلیا شاید خود بھی اپنے اس کلام کو فراموش کر چکے تھے جو اب اُن کے مجموعوں کا حصہ بننے جا رہا ہے۔

عاشقِ جونؔ' ڈاکٹر خورشید عبداللہ ایک عرصہ تک جونؔ ایلیا کے قریبی صحبت دار رہے۔ اُن کا جونؔ ایلیا سے عقیدت کا یہ حال تھا کہ جب کبھی اُنہیں جونؔ ایلیا کی کوئی غزل' نظم یا قطعہ ملا اُسے فوراً فوٹو اسٹیٹ کروا کے اپنے پاس محفوظ کر لیا۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ اس طرح وہ جونؔ ایلیا کے کلام کو اپنے طور سے محفوظ کرنے کی کوشش کر رہے تھے کیونکہ جونؔ ایلیا کی بے ترتیب بود و باش کی وجہ سے اُنہیں ہمیشہ یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں یہ سب ضائع نہ ہو جائے۔ اُن کی اس قبل از وقت احتیاط نے بہت کچھ برباد ہونے سے بچا لیا۔ ڈاکٹر خورشید عبداللہ کے دیے گئے کلام میں زیادہ حصہ جونؔ ایلیا کے پہلے مجموعۂ کلام "شاید" کے اُن اشعار کا ہے جو شائع

ہونے سے رہ گئے تھے اور جونؔ ایلیا خود کہا کرتے تھے کہ وہ ''شاید'' کو اِن اشعار کے ساتھ شائع کرنے کا اِرادہ رکھتے ہیں۔ قارئین جلد ہی ''شاید'' کے اضافی ایڈیشن میں اِن اشعار سے محظوظ ہو سکیں گے۔

اب مسئلہ اس دستیاب شدہ کلام کو اِس شکل میں لانے کا تھا کہ وہ شائع ہو سکے۔ بیشتر کاغذ بوسیدہ ہونے کی وجہ سے پھٹ رہے تھے یا اُن کے الفاظ کہیں کہیں سے مِٹ چکے تھے۔ جس کی وجہ سے اشعار کے ضائع ہونے کا اندیشہ تھا۔ کچھ غزلوں کے کئی کئی (VERSIONS) تھے۔ جس میں زیادہ مربوط اور جامع کا انتخاب کرنا تھا۔ اِس مشکل صورتحال کو دیکھتے ہوئے میں نے جونؔ ایلیا کے لڑکپن کے دوست محترم پروفیسر طہیر نفسی سے مدد کرنے کی درخواست کی۔ طہیر بھائی خود اپنی آنکھوں اور طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے کافی پریشان تھے مگر میری دلچسپی اور اصرار کو دیکھتے ہوئے بالآخر راضی ہو گئے۔ پروفیسر طہیر نفسی نے اپنے دوست اور جونؔ ایلیا کے عالمی ڈائجسٹ کے دنوں کے عالمِ بزرگ رفیقِ کار محترم سید علی قاصد زیدی صاحب کے ساتھ مِل کر اُن پھٹے اور مِٹے ہوئے اشعار کو پڑھنے میں میری مدد کی اور انہیں ضائع ہونے سے بچا لیا اور ساتھ ہی اس مجموعہ ''گویا'' کے کلام کو بھی دیکھا کہ کہیں کسی غلطی کا احتمال نہ رہ جائے۔ جونؔ ایلیا کی رثائی نظم ''مرگِ ناگہانی'' پر محترم طہیر نفسی کا مضمون ''مرگِ مسیحائی'' خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اِن دونوں محترم حضرات کی مدد کے بغیر میں اِس کلام کو قابلِ اشاعت حالت میں نہیں لا سکتا تھا۔

محترم سید علی قاصد زیدی، محترم پروفیسر طہیر نفسی، محترم علامہ علی کرّار نقوی، محترم شیخ محمد ولی واسماء ولی اور محترم ڈاکٹر خورشید عبداللہ کے اس بے لوث تعاون کی بدولت اُردو شاعری کا یہ بیش بہا سرمایہ محفوظ ہو گیا ہے۔ محترم جناب ممتاز سعید (ثمن بھائی) نے آخری لمحوں میں اس مجموعہ کی پروف ریڈنگ میں شریک ہو کر اپنا کردار ادا کیا۔ برادر محترم سید سلیم ساجد کرن اور برادر عزیز آغا وسیم کا ساتھ اور جونؔ ایلیا کے مداحوں ڈاکٹر مسرور پیرزادہ، محترمہ محور قریشی، محترمہ شہلا قمر (شہنی) اور برطانیہ (بیڈفورڈ شائر) میں قیام پذیر جناب سید اختر علی کی ہمت افزائی بھی مجھے اس مجموعہ میں حاصل رہی، جس کے لیے میں ان سب

لوگوں کا ممنون ہوں۔

اِس مجموعہ کی تیاری کے دوران جس شخصیت کی کمی مجھے ہر موقع پر محسوس ہوئی' وہ تھے جون ایلیا کے "مُحرم[1]" دوست اِدارۂ اِرتقاء کے روحِ رواں' سید سلیم ساجد کرن کے بڑے بھائی' معروف شاعر سید حسن عابد' جواب اِس جہانِ فانی سے رُخصت ہو چکے ہیں۔ حسن عابد بھائی نے جون ایلیا سے اُصولی اختلافات کے باوجود اُن کے کلام اور اُس کی اشاعت کے سلسلے میں میری کوششوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور جون ایلیا کے اہلِ خانہ اور میرے بیچ ایک پُل کا کردار ادا کرتے ہوئے مجموعوں کی اشاعت کے سلسلے کو جاری وساری کروایا۔ اُن کا جون ایلیا کے کلام کے لیے یہ کارنامہ ناقابلِ فراموش ہے۔ میں یہ مجموعہ حسن عابد بھائی کی یاد میں اُن سے منسوب کرتا ہوں۔

محترم جناب لیاقت علی عاصم (ممتاز شاعر) اور جناب جوہر عباس نے "گویا" کے پہلے ایڈیشن میں موجود غلطیوں کی طرف توجہ مبذول کروائی اور اُنھیں دُور کرنے میں میری مدد کی جس کے لیے میں ان حضرات کا شکر گزار ہوں۔

آخر میں جون ایلیا کے پرستاروں کو یہ مژدہ سناتا چلوں کہ "گویا" اِس ہلاکت خیزی کا اختتام نہیں ہے۔ آنے والے دنوں میں جون ایلیا کا مجموعہ "کیوں" اور طویل رزمیہ نظم "راموز[2]" (نئی آگ کا عہد نامہ) اس سلسلے کو مزید دراز کرتے ہوئے اِس بات کا عندیہ دے رہے ہیں کہ جون ایلیا کی اُردو شاعری میں مسلّمہ اہم حیثیت کو نئے زاویوں سے دیکھا اور پرکھا جائے گا۔

عجب ہی کچھ ہے اس بستی کا انداز
کچھ اندازہ نہیں ہے' جانے کیا ہو

خالد احمد انصاری

رابطہ: jaun_elia@yahoo.com

---

1. جون ایلیا اپنے خاص الخاص دوستوں کے حلقہ کے لیے "محرم" کی اصطلاح استعمال کرتے تھے۔ جس سے مُراد ہے "م" سے ممتاز سعید' "ح" سے حسن عابد' "ر" سے راحت سعید اور "م" سے محمد علی صدیقی۔

2. الواح پر مشتمل اس نظم کی بازگشت آج بھی ادبی حلقوں میں سنائی دیتی ہے۔ اس نظم کے متعلق مشہور ہے کہ اس نوع کی کوئی اور نظم پوری اُردو شاعری میں کہیں موجود نہیں ہے اور صرف جون ایلیا ہی تھے جو اُردو شاعری کو یہ نظم دے سکتے تھے۔ اس نظم کی اشاعت جون ایلیا اور اُردو ادب دونوں کے لیے باعثِ افتخار ہوگی۔

○

مندر ہو مسجد یا دیر' سب کا بھلا ہو' سب کی خیر
ہے یہ انسانوں کی سیر' سب کا بھلا ہو' سب کی خیر

ایک عبث جو بیچ میں ہے' اس کا رونا روئے کون
سب ہیں اپنے آپ سے غیر' سب کا بھلا ہو' سب کی خیر

آپ تو اور بھی ڈرتے ہیں' یار میاں جی شہروں سے
دل جنگل کے وحشی وطیر' سب کا بھلا ہو' سب کی خیر

میرے سارے قاتل مجھ پر جان و دل سے عاشق تھے
میں نے ہی خود کو مارا خیر' سب کا بھلا ہو' سب کی خیر

وہ جو تجھ سے پہلے تھے کب وہ پاس مرے ٹھیرے
تُو بھی میرے پاس نہ ٹھیر، سب کا بھلا ہو، سب کی خیر

اب تو اپنے بدن میں بھی کوئی نہیں اپنا یعنی
سر ہے آگے پیچھے پیر، سب کا بھلا ہو، سب کی خیر

کتنا بُرا خالق ہے تُو، ہے تری مخلوق ایک ٹھٹول
پر مت کیجو اس پر خیر، سب کا بھلا ہو، سب کی خیر

ہم تو بابا جوگی ہیں، سب کو دُعائیں دیتے ہیں
دل کے زخموں سے ہے بیر، سب کا بھلا ہو، سب کی خیر

دل بھی سرابوں میں تیرا، تم بھی سرابوں میں تیرو
او جی شناور! تُو مت تیر، سب کا بھلا ہو، سب کی خیر

خوب تھے اپنے دادا بھی، خوب تھیں اپنی نانی بھی
خوب تھے طلحہؓ اور زبیرؓ، سب کا بھلا ہو، سب کی خیر

○

یاد آؤ گے، یاد کریں گے، جانے کیا کچھ ٹھیری تھی
ہجر کے غم آباد کریں گے، جانے کیا کچھ ٹھیری تھی

دھیان لگا کر بیٹھیں گے ہم، لوگوں سے فرصت پا کر
وعدوں کی امداد کریں گے، جانے کیا کچھ ٹھیری تھی

جو لمحہ بھی بیر رکھے گا، دل لمحوں کے رشتوں سے
وہ لمحہ برباد کریں گے، جانے کیا کچھ ٹھیری تھی

تُم ٹھکرا دو گی ہر خسرو کو، رشکِ شیریں بن کر
ہم کارِ فرہاد کریں گے، جانے کیا کچھ ٹھیری تھی

جب ہونٹوں پر لگ جائے گا پہرا، تو ہم بھی آخر
سینے میں فریاد کریں گے، جانے کیا کچھ ٹھیری تھی

ہجر سخن جب کر نہ سکیں گے، شام ملالِ مہجوری
سانسوں کو برباد کریں گے، جانے کیا کچھ ٹھیری تھی

جب تنہائی میں تنہائی، پا نہ سکیں گے چار طرف
اس کو ہم ایجاد کریں گے، جانے کیا کچھ ٹھیری تھی

خون ہی تھوکیں گے ہم جانم، جانم جاناں، جانم جاں
یعنی تمہیں آزاد کریں گے، جانے کیا کچھ ٹھیری تھی

جب تعمیرِ خواب نہ ہو گی، آنکھوں کی دل بستی میں
خود کو بے بنیاد کریں گے، جانے کیا کچھ ٹھیری تھی

○

اب تو اک خواب ہوا اذنِ بیاں کا موسم
جانے کب جائے گا، یہ شورِ اذاں کا موسم

حاکمِ وقت ہوا ، حاکمِ فطرت شاید
اِن دنوں شہر میں، نافذ ہے خزاں کا موسم

حکمِ قاضی ہے کہ ماضی میں رکھا جائے ہمیں
موسمِ رفتہ رہے ، عمرِ رواں کا موسم

نمِ بادہ کا نہیں نام و نشاں اور یہاں
ہے شرربار، فقیہوں کی زباں کا موسم

کعبۂ دل پہ ہے پیرانِ حرم کی یلغار
ہائے اے پیرِ مغاں! تیری اماں کا موسم

بند ہیں دید کے دَر، وا نہیں اُمید کے دَر
ہے یہ دل شہر میں، خوابوں کے زیاں کا موسم

اک نہیں ہے کہ ترے لب سے سُنی جاتی ہے
جانے کب آئے گا، ظالم تری ہاں کا موسم

وا نہ کر بندِ قبا، یاں کی ہوا میں اپنے
بُتِ سرمست! مسلمان ہے یاں کا موسم

رنگ سرشار نہ ہو جائے فضا تو کہنا
آئے تو مستیٔ خونیں نفساں کا موسم

○

تُو ہے جن کی جان اُنھیں کی، تجھ کو نہیں پہچان سجن
تجھ پر میری جان نچھاور، اے میرے انجان سجن

دُھند ہے دیکھے سے اَن دیکھے تک، دیکھے ان دیکھے کی
اور اس دُھند میں ہے اب میرے دھیان میں بس اک دھیان سجن

میری ذات اب اک زنداں ہے، دل ہے اس کا زندانی
تُو ہے میری ذات کے اس، زندانی کا ارمان سجن

یہ جو ہم دو چار بچے ہیں، نام ترا جپنے والے
ہو سکتا ہے کچھ کر گزریں، بات ہماری مان سجن

ایسے فسادی بھی ہوتے ہیں، سوچ کے بس حیران ہوں میں
بیچ میں پڑنے والے نکلے، کیسے بے ایمان سجن

چاہ کا ناتا کیسے نبھے گا، کیسے بات بنے گی جان
میں نے کیا کچھ ٹھان رکھا ہے، تو بھی تو کچھ ٹھان سجن

ویرانوں میں کوئی نہیں جو آ نکلے اور دھوم مچے
ویرانوں کی ویرانی سے، شہر ہوئے ویران سجن

○

طلسمی سرزمیں ہے، جانے کیا ہو
یہاں کچھ بھی نہیں ہے، جانے کیا ہو

عجب ہی کچھ ہے اس بستی کا انداز
کچھ اندازہ نہیں ہے، جانے کیا ہو

کبھی اک شور اُٹھتا تھا پر اب کے
خموشی، نکتہ چیں ہے، جانے کیا ہو

گراں ہے اب یہاں جنسِ گماں بھی
وہ افلاسِ یقیں ہے، جانے کیا ہو

جُدا ہیں اور نہیں تابِ جُدائی
ابھی تک دل وہیں ہے، جانے کیا ہو

ٹھہر، اشکِ سرِ مژگانِ جاناں!
یہ میری آستیں ہے، جانے کیا ہو

یہ ہنگامِ تلاطم تھا مگر دل
تلاطم تہ نشیں ہے، جانے کیا ہو

ہیں کچھ قصے یہاں اس کے سوا بھی
اسے آنا یہیں ہے، جانے کیا ہو

کسی کے محرموں میں دل ہمارا
عبارت آفریں ہے، جانے کیا ہو

چلے تو آئے ہو تم پر مری جاں
وہ در، اب بے جبیں ہے، جانے کیا ہو

یونہی دل صبح سے اندوہگیں ہے
بہت اندوہگیں ہے، جانے کیا ہو

ہم جی رہے ہیں کوئی بہانہ کیے بغیر
اس کے بغیر، اس کی تمنا کیے بغیر

انبار اُس کا پردۂ حرمت بنا میاں
دیوار تک نہیں گری، پردہ کیے بغیر

یاراں! وہ جو ہے میرا مسیحائے جان و دل
بے حد عزیز ہے مجھے، اچھا کیے بغیر

میں بسترِ خیال پہ لیٹا ہوں اُس کے پاس
صبحِ ازل سے کوئی تقاضا کیے بغیر

اُس کا ہے جو بھی کچھ ہے مرا اور میں مگر
وہ مجھ کو چاہیے کوئی سودا کیے بغیر

یہ زندگی جو ہے اسے معنیٰ بھی چاہیے
وعدہ ہمیں قبول ہے ایفا کیے بغیر

اے قاتلوں کے شہر! بس اتنی ہی عرض ہے
میں ہوں نہ قتل کوئی تماشا کیے بغیر

مُرشد کے جُھوٹ کی تو سزا بے حساب ہے
تم چھوڑیو نہ شہر کو صحرا کیے بغیر

اُن آنکھوں میں کتنا سکون و سرور تھا
آرائشِ نظر تری پروا کیے بغیر

یاراں! خوشا! یہ روز و شبِ دل کہ اب ہمیں
سب کچھ ہے خوشگوار گوارا کیے بغیر

گریہ کناں کی فرد میں اپنا نہیں ہے نام
ہم گریہ کُن ازل کے ہیں گریہ کیے بغیر

آخر ہیں کون لوگ جو بخشے ہی جائیں گے
تاریخ کے حرام سے، توبہ کیے بغیر

سُنّی بچہ وہ کون تھا، جس کی جفا نے جون
شیعہ بنا دیا ہمیں، شیعہ کیے بغیر

اب تم کبھی نہ آؤ گے، یعنی کبھی کبھی
رخصت کرو مجھے، کوئی وعدہ کیے بغیر

○

دل نے کیا ہے قصدِ سفر، گھر سمیٹ لو
جانا ہے اس دیار سے، منظر سمیٹ لو

آزادگی میں شرط بھی ہے احتیاط کی
پرواز کا ہے اذن، مگر، پَر سمیٹ لو

حملہ ہے چار سو در و دیوارِ شہر کا
سب جنگلوں کو شہر کے اندر سمیٹ لو

بکھرا ہوا ہوں صرصرِ شامِ فراق سے
اب آ بھی جاؤ اور مجھے آکر سمیٹ لو

رکھتا نہیں ہے کوئی نگفتہ کا یاں حساب
جو کچھ ہے دل میں اس کو لبوں پر سمیٹ لو

○

حالتِ حال کے سبب، حالتِ حال ہی گئی
شوق میں کچھ نہیں گیا، شوق کی زندگی گئی

تیرا فراق جانِ جاں، عیش تھا کیا مرے لیے
یعنی ترے فراق میں، خوب شراب پی گئی

تیرے وصال کے لیے، اپنے کمال کے لیے
حالتِ دل کہ تھی خراب، اور خراب کی گئی

ایک ہی حادثہ تو ہے اور وہ یہ کہ آج تک
بات نہیں کہی گئی، بات نہیں سنی گئی

بعد بھی تیرے جانِ جاں' دل میں رہا عجب سماں
یاد رہی تری یہاں' پھر تری یاد بھی گئی

اس کے بدن کو دی نمو' ہم نے سخن میں اور پھر
اس کے بدن کے واسطے' ایک قبا بھی سی گئی

مینا بہ مینا' مے بہ مے' جام بہ جام' جم بہ جم
ناف پیالے کی ترے' یاد عجب سہی گئی

کہنی ہے مجھ کو ایک بات' آپ سے یعنی آپ سے
آپ کے شہرِ وصل میں' لذتِ ہجر بھی گئی

صحنِ خیالِ یار میں' کی نہ بسر شبِ فراق
جب سے وہ چاندنا گیا' جب سے وہ چاندنی گئی

○

نشۂ شوقِ رنگ میں، تجھ سے جُدائی کی گئی
ایک لکیر خون کی، بیچ میں کھینچ دی گئی

تھی جو کبھی سرِ سخن، میری وہ خامشی گئی
ہائے! کہن سخن کی بات، ہائے وہ بات ہی گئی

شوق کی ایک عمر میں، کیسے بدل سکے گا دل
نبضِ جنون ہی تو تھی، شہر میں ڈوبتی گئی

اُس کی گلی سے اُٹھ کے میں، آن پڑا تھا اپنے گھر
ایک گلی کی بات تھی، اور گلی گلی گئی

اُس کی اُمیدِ ناز کا‘ مجھ سے یہ مان تھا کہ آپ
عمر گزار دیجیے ‘ عمر گزار دی گئی

دَور بہ دَور‘ دل بہ دل‘ درد بہ درد‘ دَم بہ دَم
تیرے یہاں رعایتِ حال نہیں رکھی گئی

جونؔ! جنوبِ زرد کے خاک بسر‘ یہ دُکھ اُٹھا
موجِ شمالِ سبزِ جاں‘ آئی تھی اور چلی گئی

کیا وہ گماں نہیں رہا؟ ہاں وہ گماں نہیں رہا
کیا وہ اُمید بجھ گئی؟ ہاں وہ اُمید بجھ گئی

○

بات کوئی اُمید کی ' مجھ سے نہیں کہی گئی
سو مرے خواب بھی گئے ' سو مری نیند بھی گئی

دل کا تھا ایک مدّعا ' جس نے تباہ کر دیا
دل میں تھی ایک ہی تو بات ' وہ جو فقط سہی گئی

جانیے کیا تلاش تھی ' جونؔ! مرے وجود میں
جس کو میں ڈھونڈتا گیا ' جو مجھے ڈھونڈتی گئی

ایک خوشی کا حال ہے ' خوش سخناں کے درمیاں
عزتِ شاکفینِ غم ' تھی جو رہی سہی گئی

بُود و نبود کی تمیز، ایک عذاب تھی کہ تھی
یعنی تمام زندگی، دُھند میں ڈوبتی گئی

اُس کے جمال کا تھا دن، میرا وجود اور پھر
صبح سے دھوپ بجھ گئی، رات سے چاندنی گئی

جب میں تھا شہرِ ذات کا، تھا مرا ہر نفَس عذاب
پھر میں وہاں کا تھا جہاں، حالتِ ذات بھی گئی

گردفشاں ہوں دشت میں، سینہ زناں ہوں شہر میں
تھی جو صبائے سمتِ دل، جانے کہاں چلی گئی

تم نے بہت شراب پی، اس کا بھی کو دُکھ ہے جونؔ
اور جو دُکھ ہے وہ یہ ہے، تم کو شراب پی گئی

○

جان! ترے فراق میں، شام سے شب جو کی گئی
خوب شراب پی گئی، اور خراب پی گئی

شکوہ جو ہے تو اس کا ہے، شکوہ نہیں کیا گیا
رنج جو ہے تو اس کا ہے، بات فقط سہی گئی

بال و پرِ نشاط کیا، ہم سے تو اس قفس کے بیچ
بال و پرِ خیال کی، زاد بھی چھین لی گئی

پہلوے احمریں کہاں، خوابِ زمردیں کہاں
یادِ پریدہ رنگ بھی، دل سے نکال دی گئی

سود و زیاں تو خیر کیا' ان کی تمیز ہے عجب
ویسے اسی تمیز میں اپنی تو زندگی گئی

جس کا سرودِ روشنی' محفلِ شب فروز تھا
اُس دلِ داغ زار سے' اپنی ہی روشنی گئی

افشرۂ لباں ترا' ہم کو نصیب کب ہوا
سیل تمام زہر کی' نذر دہن کو دی گئی

نافِ پیالہ اُس کا تھا' جونؔ! ترے لیے تو سُن!
ایسے میں جامِ جم سے' کیوں اے مرے یار! پی گئی

O

تجھ میں پڑا ہوا ہوں، حرکت نہیں ہے مجھ میں
حالت نہ پوچھیو تُو، حالت نہیں ہے مجھ میں

اب تو نظر میں آجا، بانہوں کے گھر بھی آجا
اے جان! تیری کوئی صورت نہیں ہے مجھ میں

اے رنگ! رنگ میں آ، آغوشِ تنگ میں آ
باتیں ہی رنگ کی ہیں، رنگت نہیں ہے مجھ میں

اپنے میں ہی کسی کی، ہو رُوبروئی مجھ کو
ہوں خود سے رُوبرو میں، ہمت نہیں ہے مجھ میں

اب تو سمٹ کے آجا اور رُوح میں سما جا
ویسے کسی کی پیارے' وسعت نہیں ہے مجھ میں

شیشے کے اِس طرف سے' میں سب کو تک رہا ہوں
مرنے کی بھی کسی کو' فرصت نہیں ہے مجھ میں

تم مجھ کو اپنے رَم میں' لے جاؤ ساتھ اپنے
اپنے سے اے غزالو! وحشت نہیں ہے مجھ میں

○

اے غم! خیالِ خوں شدگاں غم، خوش آمدید
دل کے ہلالِ ماہِ محرم، خوش آمدید

شاید وہ یادِ مجلسیں تجھ دَم سے تازہ ہوں
اے موجِ یادِ درہم و برہم! خوش آمدید

ہے یاں کے اہلِ عشق کی سینہ زنی فریب
بادِ فراقِ حلقۂ ماتم، خوش آمدید

یہ بُو ہے، اے مشام نوازِ گماں شمیم!
نامحرموں میں دُور کی محرم، خوش آمدید

جانا تھا آپ ہی سے ہمیں، اے خیالِ یار!
اس پاشکستگی میں کم از کم، خوش آمدید

خونابۂ جگر کی سی پلکوں پہ ہے مہک
اے رنگ بخش دیدۂ پُرنم! خوش آمدید

اے وہمِ موجِ نکہتِ گیسوئے زارِ دوست!
اِس دم، مسیح دم، ترا زم، خوش آمدید

○

کوئی دم بھی میں کب اندر رہا ہوں
لیے ہیں سانس اور باہر رہا ہوں

دھوئیں میں سانس ہیں، سانسوں میں پل ہیں
میں روشندان تک، بس مر رہا ہوں

فنا ہر دم مجھے گنتی رہی ہے
میں اک دم کا تھا اور دن بھر رہا ہوں

ذرا اک سانس روکا تو لگا یوں
کہ اتنی دیر، اپنے گھر رہا ہوں

بجز اپنے میسر ہے مجھے کیا
سو خود سے اپنی جبیں بھر رہا ہوں

ہمیشہ زخم پہنچے ہیں مجھی کو
ہمیشہ میں پسِ لشکر رہا ہوں

لِٹا دے نیند کے بستر پہ اے رات!
میں دن بھر اپنی پلکوں پر رہا ہوں

○

ہم نے بھیجا تو اُسے کیا بھیجا
مژدۂ ترکِ مدعا بھیجا

کس کا آشوبِ رمز ہے جس نے
خامشی کو صدا صدا بھیجا

یہ بھی ہے عرضِ شوق کا اک رنگ
ہم نے نامہ، رقیب کا بھیجا

دل نے بھیجی تجھے، متاعِ وفا
دیکھ تو، وہ بھی، جو نہ تھا، بھیجا

اُس نے منزل کو بے نشاں رکھ کر
میرے قدموں کو راستہ، بھیجا

سفرِ لذتِ طلب کے لیے
میں نے بلقیس کو سبا بھیجا

ہم جو خود بھی کہیں نہیں موجود
ہم نے اپنی طرف خدا بھیجا

ہائے! رشتوں کی یہ نگہداری
اُس کی قربت نے فاصلہ بھیجا

ہم تو بکھرے پہ تامشامِ خیال
اُس کی خوشبو کو بے صبا بھیجا

اپنی خلوت میں مُخبری کے لیے
میں نے خود کو جُدا جُدا بھیجا

جونؔ! لوح و قلم کے مالک نے
دوسروں کا لِکھا ہوا بھیجا

کیا خطا تھی پیمبروں کی بھلا
کیوں غریبوں کو بے خطا بھیجا

○

کیا کہوں‘ کیا ہے مرے کشکول میں
ترکِ دنیا ہے‘ مرے کشکول میں

قیس اور لیلیٰ ہیں محمل میں سوار
اور صحرا ہے‘ مرے کشکول میں

جونؔ! اب میں کچھ نہیں ہوں لا ہُوا
اب فقط لا ہے‘ مرے کشکول میں

وہ جو ہے ہاں اور نہیں کے درمیاں
بس وہی ”یا“ ہے‘ مرے کشکول میں

اے مغاں! بھر دو اسے یعنی کہ اک
ناف پیالہ ہے، مرے کشکول میں

شش جہت کی دھوپ ہے میرا نصیب
اور سایہ ہے، مرے کشکول میں

بول اے یوسف! جو سودا ہو قبول
اک زلیخا ہے، مرے کشکول میں

اب صدا کوئی مرے لب پر نہیں
پر وہ لب وا ہے، مرے کشکول میں

ساری دنیا کا گدا پیشہ ہوں میں
ساری دنیا ہے، مرے کشکول میں

ہوں میں اک سائل مگر تیرے لیے
ایک پڑیا ہے، مرے کشکول میں

○

حال اک عکسِ حال ہے شاید
یعنی خواب اک خیال ہے شاید

وہ جو ممکن ہے اے اُمیدِ اُمید
اک محالِ محال ہے شاید

یہ نبود اور بُود کی رُوداد
اک ملالِ ملال ہے شاید

عیشِ بال و پرِ خیال جو ہے
اک قفس کا وہ مال ہے شاید

کیسا چلنا ، میں اُٹھ نہیں سکتا
یہ کوئی میری چال ہے شاید

جونؔ! ہے اک کمال ہو سکنا
اور ہونا ، زوال ہے شاید

وہ بہ شکلِ رقص گر ہے ، دل ہے سو آج
شبِ قتل و قتال ہے شاید

○

نہ کوئی ہجر، نہ کوئی وصال ہے شاید
بس ایک حالتِ بے ماہ و سال ہے شاید

ہوا ہے دیر و حرم میں جو معتکف، وہ یقین
تکانِ کشمکشِ احتمال ہے شاید

خیال و وہم سے برتر ہے اس کی ذات، سو وہ
نہایتِ ہوسِ خدّ و خال ہے شاید

میں سطحِ حرف پہ تجھ کو اُتار لایا ہوں
ترا زوال ہی میرا کمال ہے شاید

میں ایک لمحۂ موجود سے ' اِدھر نہ اُدھر
سو جو بھی میرے لیے ہے ' محال ہے شاید

وہ انہماک ہر اک کام میں کہ ختم نہ ہو
تو کوئی بات ہوئی ہے؟ ملال ہے شاید

گماں ہوا ہے یہ انبوہ سے جوابوں کے
سوال خود ہی ' جوابِ سوال ہے شاید

○

اِک ہنر ہے جو کر گیا ہوں میں
سب کے دل سے اُتر گیا ہوں میں

کیسے اپنی ہنسی کو ضبط کروں
سُن رہا ہوں کہ گھر گیا ہوں میں

کیا بتاؤں کہ مر نہیں پاتا
جیتے جی جب سے مر گیا ہوں میں

اب ہے بس اپنا سامنا درپیش
ہر کسی سے گزر گیا ہوں میں

وہی ناز و ادا ' وہی غمزے
سر بہ سر آپ پر گیا ہوں میں

عجب الزام ہوں زمانے کا
کہ یہاں سب کے سَر گیا ہوں میں

کبھی خود تک پہنچ نہیں پایا
جب کہ واں ' عمر بھر گیا ہوں میں

تم سے جاناں ملا ہوں جس دن سے
بے طرح ' خود سے ڈر گیا ہوں میں

کوئے جاناں میں سوگ برپا ہے
کہ اچانک ' سُدھر گیا ہوں میں

○

دُھوپ اٹھاتا ہوں کہ اب سر پہ کوئی بار نہیں
بیچ دیوار ہے اور سایۂ دیوار نہیں

شہر کی گشت میں ہیں صبح سے سارے منصور
اب تو منصور وہی ہے جو سرِ دار نہیں

مت سُنو مجھ سے جو آزار اُٹھانے ہوں گے
اب کے آزار یہ پھیلا ہے کہ آزار نہیں

سوچتا ہوں کہ بھلا عمر کا حاصل کیا تھا
عمر بھر سانس لیے اور کوئی انبار نہیں

جن دکانوں نے لگائے تھے نگہ میں بازار
اُن دکانوں کا یہ رونا ہے کہ بازار نہیں

اب وہ حالت ہے کہ تھک کر میں خدا ہو جاؤں
کوئی دلدار نہیں' کوئی دل آزار نہیں

مجھ سے تم کام نہ لو' کام میں لاؤ مجھ کو
کوئی تو شہر میں ایسا ہے کہ بیکار نہیں

یادِ آشوب کا عالم تو وہ عالم ہے کہ اب
یاد مستوں کو تری یاد بھی درکار نہیں

وقت کو سُود پہ دے اور نہ رکھ کوئی حساب
اب بھلا کیسا زیاں' کوئی خریدار نہیں

○

اے خرابیِ طلبِ خانۂ دل ! سُن تو سہی
میں تو برباد بھی کر دوں کوئی گھر ہو تو سہی

اے عدو! تجھ سے رکھی تیغ بھلا میں نے عزیز
ابھی کر دوں میں تیری نذر، سپر ہو تو سہی

تیرے اصرار پہ اے یار! اب آتا ہے خیال
جو چُھپانے کی خبر ہے، وہ خبر ہو تو سہی

کیوں پیمبر نہ بتاتے ہمیں حالِ فردا
آسمانوں میں کوئی پیش نگر ہو تو سہی

یوں تو واعظ کا کتب خانہ بہت ہے لیکن
علم میں جہل کا یاروں کے ضرر ہو تو سہی

○

یادوں کا حساب رکھ رہا ہوں
سینے میں عذاب رکھ رہا ہوں

تم کچھ کہے جاؤ، کیا کہوں میں
بس دل میں جواب رکھ رہا ہوں

دامن میں کیے ہیں جمع گرداب
جیبوں میں حباب رکھ رہا ہوں

آئے گا وہ نخوتی سو میں بھی
کمرے کو خراب رکھ رہا ہوں

تم پر میں، صحیفہ ہائے کہنہ
اک تازہ کتاب رکھ رہا ہوں

○

مر مِٹا ہوں خیال پر اپنے
وجد آتا ہے حال پر اپنے

ابھی مت دیجیو جواب کہ میں
جُھوم تو لوں سوال پر اپنے

عمر بھر اپنی آرزو کی ہے
مر نہ جاؤں وصال پر اپنے

اک عطا ہے مری ہوس بھی
ناز کر خدّ و خال پر اپنے

اپنا شوق ایک حیلہ ساز، سو اب
شک ہے اُس کو جمال پر اپنے

جانے اس دَم وہ کِس کا ممکن ہو
بحث مت کر، محال پر اپنے

تُو بھی آخر کمال کو پہنچا
مست ہوں میں، زوال پر اپنے

خود پہ نادم ہوں جونؔ! یعنی میں
ان دنوں ہوں، کمال پر اپنے

بس یونہی میرا گال رکھنے دے
میری جان! آج گال پر اپنے

کوئی حالت تو اعتبار میں ہے
خوش ہوا ہوں، ملال پر اپنے

○

ہم جو بے حالِ زار بیٹھے ہیں
دل کی دلّی بھی ہار بیٹھے ہیں

ایک ڈولی ہے صبح سے خالی
سرِ کوچہ، کہار بیٹھے ہیں

ہم سے مت کیجیو وجود کی بات
ہم عدم کو گزار بیٹھے ہیں

ہے وہ بد محفلی کہ مت پوچھو
یار آئے ہیں، یار بیٹھے ہیں

جانِ جانانِ زندگی! تم کیا
ہم تو خود کو سہار بیٹھے ہیں

دل سے وہ بار بار اُٹھتا ہے
اور ہم ' بار بار بیٹھے ہیں

نذرِ میر تقی میر

عشق میں جی کو صبر و تاب کہاں
اس سے آنکھیں لگیں تو خواب کہاں
(میر)

○

نشۂ جاں کی وہ شراب کہاں
اب وہ دورِ خیال و خواب کہاں

ہم کو بھی کچھ سراغ دے اے دل!
تُو ہوا تھا بھلا خراب کہاں

حرفِ سوزاں سے لب ہوئے محروم
دلِ معنی کا اضطراب کہاں

رسدِ رنگ دل کی بند ہوئی
سرِ مژگاں وہ خونِ ناب کہاں

شہر کوچے سبا کے ہیں ویران
گئی بلقیسِ خوش رکاب کہاں

دلِ نازک کا چاہیے ہے پتا
بوجھ ڈھوتے ہیں آنجناب کہاں

ہوں رواں سوئے آخرِ دنیا
دم گزاری کی مجھ میں تاب کہاں

مست اُس آستاں کے تھے ہم تو
ہم کو ہونا تھا باریاب کہاں

شور و فریاد اس گلی میں نہیں
گئے وہ خانماں خراب کہاں

کیا ہوئے دن وہ دشت گردی کے
تشنگی ہے کہاں، سراب کہاں

ہو گئے ہیں اک اور شخص کے ہم
مگر اُس شخص کا جواب کہاں

○

قابلِ رحم ہیں وہ دیوانے
جن کو حاصل نہیں ہیں ویرانے

ہم ہلاکِ ستم نہیں اے دوست!
ہم کو مارا ہے لُطفِ بیجا نے

جن کا عنوان بن گئی وہ نظر
کتنے رنگین ہیں وہ افسانے

میں تو اس زندگی سے رُوٹھا ہوں
آپ کیوں آرہے ہیں سمجھانے

میری محرومیوں کا غم ہے اُنھیں
چھلک اُٹھیں کہیں نہ پیمانے

کشتۂ اعتماد ہیں ہم لوگ
ہم کو دھوکا دیا ہے دنیا نے

تلخ گو مخلصوں کی محفل میں
جونؔ! کِس بات کا بُرا ماننے

○

فضائے رنگ میں، رنگینیٔ جاں سے لڑائی ہے
بہار آئی ہے اور جانِ بہاراں سے لڑائی ہے

یہی شاید وہ منزل ہے جہاں دل خون ہو جائے
کہ اشک اُمڈے ہوئے ہیں اور داماں سے لڑائی ہے

مشامِ شوق پر جو کچھ گزرتی ہے وہ مت پوچھو
کہ اب تک نکہتِ زلفِ پریشاں سے لڑائی ہے

وہ گیسو مجھ سے برہم ہیں، وہ عارض مجھ سے ناخوش ہیں
سمن سے، یاسمن سے، سنبلستاں سے لڑائی ہے

گلوں کی طرح میں بیجا ہنسی کیونکر ہنسوں آخر
بہت دن ہو گئے، لب ہائے خنداں سے لڑائی ہے

نہ آئیں گے اِدھر جلوے، نہ جائیں گی اُدھر نظریں
ہمارے شہر سے اور مصر و کنعاں سے لڑائی ہے

نہ ہو غمگیں شعورِ زندگی تو اور پھر کیا ہو
کہ شامِ عشرت و صبحِ غزلخواں سے لڑائی ہے

○

سیر و سفر کریں ذرا ' سلسلۂ گماں چلے
ہم تو چلے' کہاں چلے' بات یہ ہے کہاں چلے

ہم ہیں یہاں سے جا رہے' جانے کہاں ہیں جا رہے
خیر جہاں ہیں جا رہے' بس یہ سمجھ وہاں چلے

اِن مہ و سال درمیاں' عہد ہوئے تھے کچھ یہاں
گریہ کناں یہاں سے آج' ہم سوئے شہرِ جاں چلے

ہے وہ چلا چلی کہ ہے' تھم نہ سکے جو تھم رہے
دائرہ ہائے کہکشاں ' در پئے کہکشاں چلے

کچھ بھی نہیں سفر ہوا' کچھ بھی نہیں گزر ہوا
تُو نہیں چل رہا' نہ چل' تیری مگر کہاں چلے

حالتِ حال رفتگی ' کچھ نہیں جز گزشتگی
ناگزراں نفس نفس ' ہو کے گزشتگاں چلے

پاس ہو عرضِ صحن کا خاک عمارتوں کو اب
لے کے فراز ہائے بام ' سوئے فلک مکاں چلے

کوئی جبیں نہ کر سکی ' پاسِ نیازِ آستاں
ہو کے جبین سے وداع ' ناز کے آستاں چلے

سُن کے گِلے تم آئے تھے ' اب میں نہیں گِلہ کناں
اتنا بُرا ہوں میں کہ آج ' تم بھی گلہ کناں چلے

اور کہیں بسائیں گے شہرِ جبین و آستاں
جو بھی جبیں ہو اُٹھ رہے ' جو بھی ہو آستاں چلے

زخم زیاں کے بھر بھی جائیں ' تب بھی اُنھیں کھرچ کے میں
تازہ کروں اگر مرے ' رنگ کی یہ دکاں چلے

مژدہ ہمیں کہ ہم سے ہے ' آج وہ امتحاں طلب
دل شکنی کو ہم سوئے منزلِ امتحاں چلے

○

میں بے حساب سود و زیاں، کیا کروں بھلا
کوئی یقین ہے نہ گماں، کیا کروں بھلا

منزل جو اپنے دل کی تھی، خود دل میں ہی کہیں
دل بھی پہنچ سکا نہ وہاں، کیا کروں بھلا

صورت وصال کی ہے نہ حالت فراق کی
ہو جیسے آگ اور دھواں، کیا کروں بھلا

میری دکانِ ذات پہ بیٹھا ہے جانے کون
اور میں کھڑا ہوں پیشِ دکاں، کیا کروں بھلا

زخموں کا میرے اور ہی اک رنگ ہے جسے
زخموں میں بھی ملی نہ اماں، کیا کروں بھلا

O

مرے مستِ ادا! ہر اک سے مت مِل
زمانہ ہے بُرا، ہر اک سے مت مِل

مجھی سے مِل کہ میں بندہ ہوں تیرا
ہے تُو میرا خدا، ہر اک سے مت مِل

نگارا، دلبرا! کم کم نظر آ
نگارا، دلبرا! ہر اک سے مت مِل

نہ جانے کون کِن اطوار کا ہو
ہے میرا مشورہ، ہر اک سے مت مِل

مری جاں، اے مری جاں! تُو مجھے بھی
ہر اک سے مت مِلا، ہر اک سے مت مِل

نہیں ذمّہ اب آیندہ کو میرا
میں تجھ سے کہہ چکا، ہر اک سے مت مِل

کچھ ایسے بھی ہیں جن سے تُو مِلا کر
مرا کہنا ہے کیا، ہر اک سے مت مِل

نہ کر مجھ سے وفا، شکوہ نہیں ہے
مگر اے بے وفا! ہر اک سے مت مِل

یہی تو دلربائی کا ہے نکتہ
ہر اک کے دلربا، ہر اک سے مت مِل

خیال آرا رہو تُو شہرِ دل میں
نگاہوں میں نہ آ، ہر اک سے مت مِل

ہے مستِ رنگ تُو خود یک جہاں رنگ
سو مستی مت دِکھا، ہر اک سے مت مِل

عجب ناقدر ہے وہ شخص اپنا
مجھے کہنا پڑا، ہر اک سے مت مِل

○

ہر اعتبارِ حالتِ گزر میں ہے
فرصت کسے نصیب کہ فرصت گزر میں ہے

کیا طور اب گِلے کا کریں اختیار ہم
اک طورِ بے طرح ہے کہ فرقت گزر میں ہے

کیا تم وہی ہو جو تھے مری جان، میری جان!
دُکھ یہ ہے ہر گمان کی ساعت گزر میں ہے

کیا جبر و اختیار میاں جی! سو چُپ رہو
منشا مرا یہ ہے کہ مشیّت گزر میں ہے

میں رقص میں ہوں محملِ خلوت کے پیش و پس
موجِ شمیمِ محملِ خلوت گزر میں ہے

میں تم سے کیا کہوں، جو کہوں تو سخن کروں
یعنی شکستہ پائیِ حسرت گزر میں ہے

حالِ میانِ حیرتیاں ، پوچھیو نہ تُو
برپا ہے ایک حشر کہ حیرت گزر میں ہے

کیا ہے نصیبِ وعدہ و پیمانِ جان و دل
فریاد! میری اور تری صورت گزر میں ہے

ہوتا اگر کچھ اور تو مارا گیا تھا تُو
ہر لمحہ شکر کر کہ شکایت گزر میں ہے

○

کوئی حالت بھی اب طاری نہیں ہے
تو کیا یہ دل کی ناداری نہیں ہے

میں ہوں ایسے سفر پر جانے والا
کہ جس کی کوئی تیاری نہیں ہے

ہوں زد پر اس طرح تیرِ فنا کی
ابھی جیسے مری باری نہیں ہے

کہوں کیا، کتنا بے آرام ہوں میں
مری اُمید ابھی ہاری نہیں ہے

میں اپنے آپ سے ہوں غیر کتنا
کسی سے بھی مری یاری نہیں ہے

ہوں بے حد تنگ اپنے آپ سے میں
کہ اب تک خود سے بیزاری نہیں ہے

یہ میری زندگی، میری اذیت
ہے ایسا وار، جو کاری نہیں ہے

علم اُٹھتے تو ہیں اب بھی ہمارے
مگر وہ گریہ و زاری نہیں ہے

گِلہ کر اب بچھڑنے میں ہمارے
مری جاں! کوئی دشواری نہیں ہے

○

عہدِ رفتہ کی متاعِ کارواں گُم ہوگئی
آہ! بُوئے یُوسفِ کنعانِ جاں گُم ہوگئی

عالمِ غربت میں غارت ہوگئی جنسِ ہنر
قحط سالی میں ذخائر کی دکاں گُم ہوگئی

عید کے دن میں نے سوچا تھا بہل جائے گا دل
عید کے دن میری دولت، بے گماں گُم ہوگئی

آہ! وہ عذرائے فن کا عنفوانِ دلبری
ہائے! آغازِ جنوں کی داستاں گُم ہوگئی

مجھ سے کچھ بھی تو نہیں آتا ہے اس فن کے سوا
اے مری مضراب! تُو آخر کہاں گم ہو گئی

بول اے بد بخت! وہ ساماں کہاں غارت کیا
سوچ دیوانے! کہ وہ دولت کہاں گم ہو گئی

چند اوراقِ پریشاں تھے مری کُل کائنات
کائناتِ خانۂ بے خانماں گم ہو گئی

○

پرتوِ جاں، بہت ہی کم ٹھیرا
ہم میں جاناں، بہت ہی کم ٹھیرا

ہم تو آئے تھے حشر عرصہ طلب
پر بیاباں، بہت ہی کم ٹھیرا

ہم تھے یزداں طلب ہمیشہ کے
اور یزداں، بہت ہی کم ٹھیرا

تھا عجب بے حساب دستِ جنوں
سو گریباں، بہت ہی کم ٹھیرا

تھا ہمارا خیال اور کہیں
عہد و پیماں، بہت ہی کم ٹھیرا

ہم تھے خوابیدہ گردِ حالتِ دل
شہرِ خوباں، بہت ہی کم ٹھیرا

تھی یہ کہنہ سرائے دل ہی خراب
جو بھی تھا یاں، بہت ہی کم ٹھیرا

تھی ہوس حالتی ہمہ مطلب
اور ساماں، بہت ہی کم ٹھیرا

○

محفل رسمیں برتی جاتیں، تھے آخر یکجا بیٹھے
سیکھے نہ ہم بیگانہ ادائی، باہم بیگانہ بیٹھے

ایک نفس گزران میں آخر کیا فرقِ یار و اغیار
کس کی نشست اور کیسا حلقہ، جو بھی جہاں بیٹھا بیٹھے

حالت کی بے ترکیبی نے دل کو کہیں کا بھی نہ رکھا
دل میں ہنسنا، لب پر رونا، اُلجھے اور اُلجھا بیٹھے

آ کے گلے لگ جاتا گر وہ ہوتا حالت فہم، کہ ہم
اُس سے لڑ کر اپنا رشتہ اور کہیں ٹھہرا بیٹھے

دشت میں خاک اُڑانے ہی سے لیلیٰ آن پہنچتی تھی
اب مجنونی شہر میں کی ہے، دیکھیں کیا خرچا بیٹھے

اب ہم بچھڑے ہیں سائے سے ورنہ اب تک ایسا تھا
سر سے کسی کا سایہ اُٹھا تو، برگد نیچے جا بیٹھے

بادِ حوادث حلقہ زناں ہے، میں ہوں غبارِ دشتِ گماں
بیٹھا ہوں تو حیرانی کر، ایک بگولا کیا بیٹھے

ایک خلش ایسی ہے دل میں، جس کا درماں کوئی نہیں
کوئی خلش اب دل میں نہیں ہے، سب کچھ ہم نمٹا بیٹھے

یار ہماری رسوائی کے داد طلب ہوں اب ہم تو
شہروں، شہروں، رسوا ہو کر، اک گوشے میں آ بیٹھے

شہر کے جنگل والے مگن ہیں دفتی کی دیواروں پر
پیتل کے پھول اور پیڑوں کو قابوں میں لگوا بیٹھے

○

کہتے ہیں جس کو ذات وہ گویا کہیں نہیں
دنیا میں دیکھ آئے ' یہ دَر وا کہیں نہیں

صحرا پہ میں نے آج یہ نکتہ رَقم کیا
دریا کا علم مجز تہِ دریا کہیں نہیں

پائے سفر شکستہ ہوئے ' مدتیں ہوئیں
میں راستے میں ہوں ابھی' پہنچا کہیں نہیں

دے مال ہم کو مفت' ہم اصحابِ کہف ہیں
سِکّہ ہمارے دور کا چلتا کہیں نہیں

○

ہر مذہب اپنی سچائی کے ثبوت میں کوئی نہ کوئی معجزہ پیش کرتا ہے۔ فاطمہ زرّیں تاج جسے دنیا قرۃ العین طاہرہ کے نام سے جانتی ہے' بابی و بہائی مذہب کا ایک بولتا ہوا معجزہ تھی۔ معجزۂ ذہانت اور معجزۂ حُسن۔ ''کنارِ آبِ رُکنا باد'' اور ''گلگشتِ مصلیٰ'' کی سرمست و سرشار تہذیب نے اُس سے زیادہ پُرفن' پُرفسوں اور پُرکار شاعرہ آج تک پیدا نہیں کی۔ ذیل میں ہم اِس عظیم شاعرہ کے چار شعر پیش کر رہے ہیں جنہیں جونؔ ایلیا نے اُردو کا لباس پہنایا ہے۔

گر بہ تو اُفتدم نظر' چہرہ بہ چہرہ' رُو بہ رُو
شرح دہم غمِ ترا' نکتہ بہ نکتہ' مُو بہ مُو
می رود از فراقِ تو' خونِ دل از دو دیدہ اَم
دجلہ بہ دجلہ' یم بہ یم' چشمہ بہ چشمہ' جُو بہ جُو

ترجمہ: تم سے ہو گفتگو اگر' چہرہ بہ چہرہ' رُو بہ رُو
شرحِ غمِ وفا کروں' نکتہ بہ نکتہ' مُو بہ مُو
ہے غمِ ہجر میں رَواں' آنکھ سے میری خونِ دل
دجلہ بہ دجلہ' یم بہ یم' چشمہ بہ چشمہ' جُو بہ جُو

خال بہ کُنجِ لب یکے' طرّۂ مشکفام دو
وائے بحالِ مرغِ دل' دانہ یکے و دام دو
محتسب است شیخ و من' صحبتِ عشق درمیاں
از چہ کُنم مجابشاں' پختہ یکے و خام دو

ترجمہ: خالِ فسوں طراز ایک' گیسوئے مشک فام دو
اُف یہ نصیبِ مرغِ دل' دانہ ہے ایک' دام دو
عشق کی بحث کے حریف' واعظ و شیخ اور میں
بحث سے فائدہ ہی کیا' پختہ ہے ایک' خام دو

جونؔ ایلیا نے اس خوبصورت غزل کی حسین اور منفرد ہیئت میں خود بھی طبع آزمائی فرمائی تھی۔ اگلے صفحہ پر اس غزل کا نقشِ ثانی ملاحظہ فرمائیں۔

O

بخششِ نرگسِ صنم، دَور بہ دَور، دَم بہ دَم
مینا بہ مینا، مے بہ مے، جام بہ جام، جَم بہ جَم

حالتِ بے علاقگی، قاتلہ ہے سو چاہیے
ایک غزل، غزلِ غزال اور غزال رَم بہ رَم

زندہ کرو دیار کو، حالتِ خوار خوار کو
شور بہ شور، شب بہ شب، نالہ بہ نالہ، نَم بہ نَم

ایک وصال ہے کہ ہے، ایک فراق ہے کہ ہے
حال بہ حال، ہم بہ ہم، کیف بہ کیف، کم بہ کم

میں تو ہوں زندہ آج بھی اب نئے سرے سے کچھ کرو
حیلہ بہ حیلہ، زد بہ زد، زخم بہ زخم، سَم بہ سَم

ایک خرابِ کاریٔ تیشہ بہ تیشہ چاہیے
کوچہ بہ کوچہ، رَو بہ رَو، خانہ بہ خانہ، خَم بہ خَم

یار ہماری داستاں، نوحہ ہے اور نوحہ خواں
ہائے بہ ہائے، ہُو بہ ہُو، حیف بہ حیف، ہم بہ ہم

ورثہ عجیب شبیہ کا، جونؔ! تمہیں دیا گیا
آہ بہ آہ، اُف بہ اُف، غزوہ بہ غزوہ، غم بہ غم

شانہ بہ شانہ رشتہ ہے اور ترے مو بہ مو سے ہے
حلقہ بہ حلقہ، سر بہ سر، تار بہ تار، خم بہ خم

ذات کا نشہ ہے عجب، جس کی ہے تشنگی غضب
دَور بہ دَور، دل بہ دل، درد بہ درد، دَم بہ دَم

○

حشرِ دل شہر میں بپا تو ہو
کوئی گھر سے نکل سکا تو ہو

لذتِ ترکِ مُدّعا ہو نصیب
پر میاں کوئی مُدّعا تو ہو

بِکھروں کو تو راس آئے گی
کوئی بلقیسِ بے سبا تو ہو

خود کو حال اپنا میں سُناؤں جناب
پر کبھی اپنا سامنا تو ہو

ہم تو گھر میں بھی خاک اُڑا لیں گے
کوئی گھر سے گیا ہوا تو ہو

بُود، جز لمحہ کچھ نہیں شاید
کوئی لمحہ گزر رہا تو ہو

اِک خموشی میں ہے سخن برپا
کچھ کہا تو ہو، کچھ سُنا تو ہو

○

کام مجھ سے کوئی ہوا ہی نہیں
بات یہ ہے کہ میں تو تھا ہی نہیں

مجھ سے بچھڑی جو موجِ نکہتِ یار
پھر میں اس شہر میں رہا ہی نہیں

کس طرح ترکِ مدّعا کیجیے
جب کوئی اپنا مدّعا ہی نہیں

کون ہوں میں جو رائیگاں ہی گیا
کون تھا جو کبھی مِلا ہی نہیں

ہوں عجب عیشِ غم کی حالت میں
اب کسی سے کوئی گِلہ ہی نہیں

بات ہے راستے پہ جانے کی
اور جانے کا راستہ ہی نہیں

ہے خدا ہی پہ منحصر ہر بات
اور آفت یہ ہے، خدا ہی نہیں

دل کی دنیا کچھ اور ہی ہوتی
کیا کہیں اپنا بس چلا ہی نہیں

اب تو مشکل ہے زندگی دل کی
یعنی اب کوئی ماجرا ہی نہیں

ہر طرف ایک حشر برپا ہے
جونؔ! خود سے نکل کے جا ہی نہیں

موج آتی تھی ٹھیرنے کی جہاں
اب وہاں خیمۂ صبا ہی نہیں

○

تھا جب تک معیاد کے اندر، عہدِ وصالِ شامِ فراق
کتنی خیال انگیز آتی تھی، یادِ ملالِ شامِ فراق

اِک بے شکوہ محرومی ہے اور تمہارے شکر گزار
شاید شامِ وصل تھی اپنی، شامِ زوالِ شامِ فراق

ایسی بے عہد و پیمانی اور ویرانی رشتوں کی
کوئی بھی صبحِ ذات نہیں ہے، صبحِ خیالِ شامِ فراق

دل کے لمحو یاد دِلاؤ، مجھ کو کوئی شامِ وصال
جس کے نام لکھوں اور بھیجوں، اپنا حالِ شامِ فراق

کیا کیا مجلس برپا کی ہے' میری سخن احوالی نے
شاید مجھ کو یاد رہے ہوں' کچھ اقوالِ شامِ فراق

میں تم سب کی ایک نہ مانوں' تم سب مجھ کو سمجھاؤ
آؤ پھر آغاز کریں ہم' بحث و جدالِ شامِ فراق

ہر شکوہ اک نغمۂ جاں تھا' مستیِ جاں لب پرور تھی
یادِ جمالِ یار تھی جب تک' یادِ جمالِ شامِ فراق

رشتۂ دردِ فراق کا بھی کیا' اس نے ہم سے توڑ لیا
شامِ فراقِ یار آئی ہے' بے احوالِ شامِ فراق

○

ہم سب کے طرفدار ہیں پر دل کے نہیں ہیں
محفل میں ہیں اور رونقِ محفل کے نہیں ہیں

دل خون کیا ہم نے سرِ کوچۂ قاتل
بسمل ہیں مگر خنجرِ قاتل کے نہیں ہیں

بے نام و نشاں زخم ہیں، سینے میں ہمارے
کچھ وار ہوئے ہیں جو مقابل کے نہیں ہیں

اس رنگ کے طوفاں نے نگاہوں کو ہماری
دکھلائے ہیں جو خواب' وہ ساحل کے نہیں ہیں

یہ وقت کے صحرا میں بھٹکتے ہوئے راہی
منزل پہ چلے آئے ہیں' منزل کے نہیں ہیں

○

نظر حیران دل ویران، میرا جی نہیں لگتا
بچھڑ کے تم سے میری جان! میرا جی نہیں لگتا

کوئی بھی تو نہیں ہے جو، پکارے راہ میں مجھ کو
ہوں میں بے نام اک انسان، میرا جی نہیں لگتا

ہے اک انبوہ قدموں کا رواں ان شاہراہوں پر
نہیں میری کوئی پہچان، میرا جی نہیں لگتا

جہاں ملتے تھے ہم تم اور جہاں مل کر بچھڑتے تھے
نہ وہ در ہے، نہ وہ دالان، میرا جی نہیں لگتا

ہوں پہچانے ہوئے چہرے تو جی کو آس رہتی ہے
ہوں چہرے ہجر کے انجان، میرا جی نہیں لگتا

یہ سارا شہر اک دشتِ ہجومِ بے نیازی ہے
یہاں کا شور ہے ویران، میرا جی نہیں لگتا

وہ عالم ہے کہ جیسے میں کوئی ہم نام ہوں اپنا
نہ حرماں ہے نہ وہ درمان، میرا جی نہیں لگتا

کہیں سر ہے کہیں سودا، کہیں وحشت کہیں صحرا
کہیں میں ہوں، کہیں سامان، میرا جی نہیں لگتا

میرے ہی شہر میں، میرے محلّہ میں، میرے گھر میں
بلا لو تم مجھے مہمان، میرا جی نہیں لگتا

میں تم کو بھول جاؤں، بھولنے کا دکھ نہ بھولوں گا
نہیں ہے کھیل یہ آسان، میرا جی نہیں لگتا

کوئی پیمان پورا ہو نہیں سکتا مگر پھر بھی
کرو تازہ کوئی پیمان، میرا جی نہیں لگتا

کچھ ایسا ہے کہ جیسے میں یہاں ہوں ایک زندانی
ہیں سارے لوگ زنداں بان، میرا جی نہیں لگتا

○

ہوئے جاتا ہے پُر فن، دم لے
ہے یہ سب سے بڑی تھکن، دم لے

صورت آشوب تر ہے شانہ کشی
ہیں وہ گیسو شکن شکن، دم لے

نطق و گویائی نابجا تر ہیں
یعنی فطرت ہے بے سخن، دم لے

آدمی رہ رہا ہے پیڑوں پہ
کیا میاں جی میاں وطن، دم لے

دَم گزاری کا اک بہانہ تھا
یعنی کچھ بھی نہیں ہے فن، دَم لے

زَر کے بازار کو لگا دے آگ
یعنی تُو کوئی شے نہ بَن، دَم لے

عطش انگیز تر ہیں وہ بوسے
حرصِ شہوت میں تُو نہ تَن، دَم لے

آنے والا ہے دورِ خاموشی
گفتگو ہے گنوارپن، دَم لے

○

لائی تھی شامِ دل کی عجب لہر میں ہمیں
اُس چشم نے پلائی مگر زہر میں ہمیں

فتنے اُٹھے ہیں ہم سے بہت ' تیرے شہر میں
آنا نہ چاہیے تھا ' تیرے شہر میں ہمیں

نہلا رہا ہے پرتوِ رنگِ بدن ترا
صبحِ بہار کی شفقیں نہر میں ہمیں

اب آ کہ بے گلہ ہی ملیں گے ہم اب تجھے
کوئی بھی غم رہا نہ غمِ دہر میں ہمیں

ہر سانس اس کا شعلۂ خواہش فروز تھا
کیسا ہوس فزا وہ لگا ، قہر میں ہمیں

○

جونؔ! تمہارا دشتِ جہل ' عجب گماں میں ہے
جو بھی تھا آسماں میں تھا ' جو بھی ہے آسماں میں ہے

جو ہے یقیں میں مبتلا ' اس کا خدا کرے بھلا
بات قسم سے جو کہے ' وہ تو فضولیاں میں ہے

خیمۂ رہِ خیال میں ' آ گیا شوقِ حال میں
جان! مرا زیاں ہے تُو ' تُو بھی تو ہاں زیاں میں ہے

ایک سرودِ آتشیں ' جادۂ برف برف میں
کب سے ہے برف روب جونؔ اور یہ دل تپاں میں ہے

ایک سوالِ گرم جونؔ، شہر میں ہے خبر طرح
وہ جو ہے کیا "نہیں" میں ہے، وہ جو ہے کیا وہ "ہاں" میں ہے

وہ جو ہے بیکرانِ دل، وہ جو ہے بیکرانِ جاں
اس کا ہے دھیان کیوں میاں، وہ تو کسی کراں میں ہے

یاد کی یاد کچھ نہ پوچھ، کتنی ہے سرد و سنگ دل
وہ جو کبھی کا تھا کہ تھا، اب وہ عذابیاں میں ہے

گنگ و جمن کا مسخرہ، کل تھا نجف میں کہہ رہا
جو کبھی میرِ شہر تھا، شہرِ سپردگاں میں ہے

بات جو میرے گھر کی تھی، وہ تو تمام تر کی تھی
زخمِ نماز ارے! ارے! زہرِ اذاں، اذاں میں ہے

بات جو ہر پلک کی ہے، وہ کہیں اب تلک کی ہے
میں بھی گزشتگاں میں ہوں، تُو بھی گزشتگاں میں ہے

○

کیا کہیں تم سے بود و باش اپنی
کام ہی کیا، وہی تلاش اپنی

کوئی دم ایسی زندگی بھی کریں
اپنا سینہ ہو اور خراش اپنی

اپنے ہی تیشۂ ندامت سے
ذات ہے اب تو، پاش پاش اپنی

ہے لبوں پر نفس زنی کی دکاں
یاوہ گوئی ہے بس معاش اپنی

تیری صورت پہ ہوں نثار پہ اب
اور صورت کوئی تراش اپنی

جسم و جاں کو تو بیچ ہی ڈالا
اب مجھے بیچنی ہے لاش اپنی

O

میرے مطلوب و مدعا! تُو جا
تجھ سے مطلب نہیں ہے جا' تُو جا

اب شہادت ہوس ہے یاروں کو
ہوش معزول ہو رہا' تُو جا

تُو کسی حال میں بھی ہو اس پَل
اگلی پَل کا ہے اقتضا' تُو جا

ہو گیا ہوں میں تیری ذات میں گُم
اب میں تیرا نہیں رہا' تُو جا

اب تری بات تیری حد میں نہیں
شوق بڑھنے لگا ترا، تُو جا

جانے میں کب کا آچکا خود میں
جانے تُو کب کا جا چکا، تُو جا

ہے مجھے تیری جستجو کرنا
تُو عجب آدمی لگا، تُو جا

ہے تری ذات کیا خیال انگیز
اب ترا کام کیا رہا، تُو جا

○

مجھ میں، مجھ دل میں تُو ڈھلا، تُو جا
ہو میاں جی ترا بھلا، تُو جا

آپ اپنے سے کر کے اپنا سخن
چِھل گیا ہے مرا گلا، تُو جا

مُجھ کو تیری تلاش کرنا ہے
لے میاں! خود سے میں چلا، تُو جا

اب سجن! دونوں وقت ملتے ہیں
آرزو کا دِیا جلا، تُو جا

ہے مرے کو ترے خیال کی دُھن
نہیں میں تیرا مُبتلا ، تُو جا

تیرے ہونے کی اور نہ ہونے کی
بات ہونا ہے بَرمَلا ، تُو جا

وصل ہر لمحے کی جُدائی ہے
خود سے اور تجھ سے میں ٹلا، تُو جا

جو ہنر کی نمو ہو دُکھ، وہ ابھی
میرے دل میں نہیں پھلا ، تُو جا

تُو جو ہے، میرا چارہ گر ہے تُو
میں پیوں گا الا بلا ، تُو جا

○

کیا ہو گیا ہے گیسوئے خمدار کو ترے
آزاد کر رہے ہیں گرفتار کو ترے

اب تُو ہے مدتوں سے شب و روز رُوبرو
کتنے ہی دن گزر گئے دیدار کو ترے

کل رات چوب دار سمیت آ کے لے گیا
اک غولِ طرحدار، سرِدار کو ترے

اب اتنی کند ہو گئی دھار، اے یقیں تری!
اب روکتا نہیں ہے کوئی، وار کو ترے

اب رشتۂ مریض و مسیحا ہوا ہے خوار
سب پیشہ ور سمجھتے ہیں، بیمار کو ترے

باہر نکل کے آ، در و دیوارِ ذات سے
لے جائے گی ہوا، در و دیوار کو ترے

اے رنگ! اس میں سُود ہے تیرا، زیاں نہیں
خوشبو اُڑا کے لے گئی، زنگار کو ترے

○

جازم پہ پڑے ہوئے ہیں جنگل
میزوں میں جڑے ہوئے ہیں جنگل

خشکی کا لِکھا ہے خاک اُڑنا
بیکار اُڑے ہوئے ہیں جنگل

دیوار پہ تھالیاں بجی ہیں
پیتل میں گڑے ہوئے ہیں جنگل

آمنے کو اِدھر ہے شہر کوئی
لینے کو کھڑے ہوئے ہیں جنگل

لوں سانس میں، کس ہوا میں جا کر
اندر سے سڑے ہوئے ہیں جنگل

پانی پہ چڑھا ہوا ہے شیشہ
شیشے میں کھڑے ہوئے ہیں جنگل

○

ہر گماں جس پہ وار ڈالا ہے
اُس نے ہی مجھ کو مار ڈالا ہے

نہ اُتارا کسی نے جامۂ رنگ
یاں بدن تک اُتار ڈالا ہے

خود تن آساں ہے روشنی کتنی
مجھ پہ کرنوں کا بار ڈالا ہے

دید تُو نے نگہ کے دامن میں
یاد رکھنا ' غبار ڈالا ہے

میں نے قدموں میں تیرے دامن کش
دامنِ تار تار ڈالا ہے

بات ایسی ہی تھی کہ اب میں نے
بیچ میں خود کو یار ڈالا ہے

ہار کر اُس سے اُس کی گردن میں
میں نے ہی بڑھ کے ہار ڈالا ہے

اب نہ لڑنا کہ ہم نے دنیا کو
بیچ میں بار بار ڈالا ہے

اپنے آگے مجھ آبلہ پا نے
خود ہی اک خارزار ڈالا ہے

میرے زخموں نے تیرا موسم رنگ
خون ہو کر گزار ڈالا ہے

ہوں پہنچ پار خود سے اور اُسے
اور بھی دُور پار ڈالا ہے

○

وہ پیشہ ور ہیں جو لوگوں کے زخم سیتے ہیں
ہمارے زخم ہمارے بہت چہیتے ہیں

شبِ فراق کا ہم کو کبھی گِلہ نہ ہوا
وہ دن وصال کے دن تھے، جو ہم پہ بیتے ہیں

کوئی بتاؤ کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے؟
وہ جانِ جاں تھا مگر، ہم تو اب بھی جیتے ہیں

نیازمند ہوں میں اپنے قدردانوں کا
جو آ کے شام کو میری شراب پیتے ہیں

ہمیں بھی سوختہ کرتے ہیں اور تم کو بھی
ہمارے لفظ نہیں ہیں میاں، فلیتے ہیں

○

چار سوئے نگاہ میں گرد اُڑائی چاہیے
دُھند کی شکل بھی کوئی دید میں آئی چاہیے

صوت و صدا کی موج ہے آں طرف سکوت تک
حالتِ خامشی کو بھی اک شنوائی چاہیے

ایسا نگارِ دلنشیں ' ایسا خیال آفریں
اُس کا جواب ہی نہیں' اُس سے جُدائی چاہیے

جسم کو جاں کہا کرو' جاں کو جہاں کہا کرو
میں تو کہوں کہ لفظ کی' قید اُٹھائی چاہیے

ایک تھی بس خدا کی ذات' یار عجیب تھی یہ بات
ایسی ہی کوئی دوسری بات' یار بنائی چاہیے

ہم ہیں جمال کے فقیر' سب کے دعائے دلپذیر
شہرِ جمال میں ہمیں' سب سے بھلائی چاہیے

شوق خدائی کا بجا' خود میں بھی آؤ اک ذرا
اپنی طرف بھی اک نظر' اے مرے بھائی! چاہیے

شہر ہی شہر ہیں کہ ہیں' کوئی نہیں ہے شہر خیز
آؤ چلو کہ شہر شہر' دھوم مچائی چاہیے

○

محبت ہوتے ہوتے' اک ندامت ہو گئی آخر
ندامت ہوتے ہوتے' اک اذیت ہو گئی آخر

عجب انداز سے طے مرحلے دل کے کیے ہم نے
جو دل کی نازبرداری تھی' نفرت ہو گئی آخر

بھلا معلوم کیا ہو گا اُسے' اُس کی جدائی میں
ہمیں خود اپنے شکووں سے' شکایت ہو گئی آخر

کمینے ہو گئے جذبے' ہوئے بدنام خواب اپنے
کبھی اُس سے' کبھی اُس سے' محبت ہو گئی آخر

سپہرِ خامشی ہے' شام ہے اور صحنِ ویرانی
وہ شامِ فصلِ سرسبزی' حکایت ہو گئی آخر

جدائی جو کبھی تھی اک عذابِ جاودانِ جاں
گِلہ یہ ہے وہی دل کی سہولت ہوگئی آخر

نہ جانے محملِ لیلیٰ نے کیا دستور اپنایا
کہ دل کو قیس کے صحرا سے وحشت ہوگئی آخر

نہیں اس کی فریبائی ذرا بھی ذکر کے قابل
کہ برہم خود فریبِ دل کی صحبت ہوگئی آخر

مناؤ جانِ جاں! اب جشن تم اپنی فراغت کا
کہ ہوتے ہوتے حالت دل کی رُخصت ہوگئی آخر

ہے کیا شوق ہمیشہ اور کیا عشقِ ہمیشہ ہے
کہ تھا اک حال سا پھر ایک حالت ہوگئی آخر

گماں دل سے گئے سو دل گیا اپنے گمانوں سے
دریغا! پھر تو بس فرصت ہی فرصت ہوگئی آخر

وبائیں پھیلتی رہتی تھیں دل بستی میں پر یاراں!
پھر اس بستی کو ناگاہاں شریعت ہوگئی آخر

فراقِ وصل کا تھا کیا زمانہ کیا کہوں یعنی
فقط اک آن تھی جو بے نہایت ہو گئی آخر

مکانوں اور دکانوں پر عجب اِک سانحہ گزرا
ضرورت کی ہر اک شے بے ضرورت ہو گئی آخر

چلے تھے ہم شمالِ تیرہ سبزِ خواب خواباں سے
ہماری سمتِ جبرِ زرد قسمت ہو گئی آخر

نہ کوئی حالِ دل تھا اور نہ کوئی حالتِ جاں تھی
ہمیں اُس سے، اُسے ہم سے، محبت ہو گئی آخر

سنائیؔ اور رومیؔ ایسے زہری تھے کہ مت پوچھو
خمِ دل کوچہ پر دانش کی رحلت ہو گئی آخر

میاں جب ہفت شہرِ عشق میں عطار گھوم آیا
اَزاں بعد ان پہ برپا اک قیامت ہو گئی آخر

غبارِ روشنی میں ہُود نے کاٹی شبِ ہجرت
شبِ ہجرت، دوامِ صبحِ ہجرت ہو گئی آخر

○

شاخِ اُمید جَل گئی ہو گی
دل کی حالت سنبھل گئی ہو گی

جونؔ! اس آن تک بخیر ہوں میں
زندگی داؤ چَل گئی ہو گی

اک جہنم ہے میرا سینہ بھی
آرزو کب کی گَل گئی ہو گی

سوزشِ پرتوِ نگاہ نہ پُوچھ
مَردُمک تو پگھل گئی ہو گی

ہم نے دیکھے تھے خواب شعلوں کے
نیند آنکھوں میں جل گئی ہوگی

اُس نے مایوس کر دیا ہوگا
پھانس دل سے نکل گئی ہوگی

اب تو دل ہی بدل گیا اب تو
ساری دنیا بدل گئی ہوگی

دل گلی میں رقیبِ دل کا جلوس
واں تو تلوار چَل گئی ہوگی

گھر سے جس روز میں چلا ہوں گا
دل کی دِلّی مچل گئی ہوگی

دھوپ، یعنی کہ زرد زردسی دھوپ
لال قلعے سے ڈھل گئی ہوگی

ہجر حدّت میں یاد کی خوشبو
ایک پنکھا سا جھل گئی ہوگی

آئی تھی موجِ سبزِ بادِ شمال
یاد کی شاخ پھل گئی ہوگی

وہ دمِ صبح، غسل خانے میں
میرے پہلو سے، شل گئی ہوگی

شامِ صبحِ فراق دائم ہے
اب طبیعت بہل گئی ہوگی

○

اپنا خاکہ لگتا ہوں
ایک تماشا لگتا ہوں

آئینوں کو زنگ لگا
اب میں کیسا لگتا ہوں

اب میں کوئی شخص نہیں
اُس کا سایہ لگتا ہوں

سارے رشتے تشنہ ہیں
کیا میں دریا لگتا ہوں

اُس سے گلے مِل کر خود کو
تنہا تنہا لگتا ہوں

خود کو میں سب آنکھوں میں
دُھندلا دُھندلا لگتا ہوں

میں ہر لمحہ اس گھر سے
جانے والا لگتا ہوں

کیا ہوئے وہ سب لوگ کہ میں
سُونا سُونا لگتا ہوں

مصلحت اس میں کیا ہے مری
ٹُوٹا پھُوٹا لگتا ہوں

کیا تم کو اس حال میں بھی
میں دنیا کا لگتا ہوں

کب کا روگی ہوں ویسے
شہرِ مسیحا لگتا ہوں

میرا تالُو تر کر دو
سچ مُچ پیاسا لگتا ہوں

مجھ سے کمالو کچھ پیسے
زندہ مُردہ لگتا ہوں

میں نے سہے ہیں مکر اپنے
اب بے چارہ لگتا ہوں

○

زندگی پُروفائی کی ٹھیری
پھر ہمیشہ جدائی کی ٹھیری

نسبتِ جان و دل ہوئی برباد
پھر فقط، آشنائی کی ٹھیری

جان و دل کا تھا ایک رمز، جو تھا
آخرش، جگ ہنسائی کی ٹھیری

رہے پہلے وفا سراپا۔ ہم
اور پھر بےوفائی کی ٹھیری

ہم تھے اک دوسرے کے پہلو میں
پھر میاں! نارسائی کی ٹھیری

ہم جو تھے ایک جان تھے دونوں
کہ اچانک لڑائی کی ٹھیری

میں اسے جان کر نہ پہچانا
ہجر میں بھی کمائی کی ٹھیری

ہم حسینوں میں ناقبول ہوئے
سو میاں، پارسائی کی ٹھیری

آخرش اُس کو ہم نے کھینچ لیا
بات اس کی کلائی کی ٹھیری

ہوئے برباد آدم و ابلیس
جب ازل میں خدائی کی ٹھیری

آپ ملتے نہیں ہیں، ملیے تو
اس قدر کیوں بُرائی کی ٹھیری

وہ حیا تھا، حیا کی جان تھا وہ
اور پھر بےحیائی کی ٹھیری

تھا سروں میں بھلائی کا سودا
جانے پھر کیوں، بُرائی کی ٹھیری

شہر ہم کو ذرا نہیں بھائے
آخرش، بادپائی کی ٹھیری

ہم کو گھر چاہیے تھا جو نہ مِلا
سو میاں، ناکجائی کی ٹھیری

اس کے پستان تھے کہ حشرِ نظر
پھر تو لب آزمائی کی ٹھیری

کیا ازل، کیا ابد، میاں جی میاں
آن اک انتہائی کی ٹھیری

بیچ گھر اپنے کھنچ گئی دیوار
پھر فقط اِک دہائی کی ٹھیری

○

جو گزر دشمن ہے، اس کا رہگزر رکھا ہے نام
ذات سے اپنی نہ ملنے کا سفر رکھا ہے نام

پڑ گیا ہے اک بھنور، اس کو سمجھ بیٹھے ہیں گھر
لہر اُٹھی ہے، لہر کا دیوار و در رکھا ہے نام

نام جس کا بھی نکل جائے اُسی پر ہے مدار
اس کا ہونا یا نہ ہونا کیا، مگر رکھا ہے نام

ہم یہاں خود آئے ہیں، لایا نہیں کوئی ہمیں
اور خدا کا ہم نے اپنے نام پر رکھا ہے نام

چاک چاک دیکھ کر پیراہنِ پہنائی کی
میں نے اپنے ہر نفس کا' بخیہ گر رکھا ہے نام

میرا سینہ کوئی چھلنی بھی اگر کر دے تو کیا
میں نے تو اب اپنے سینے کا' سپر رکھا ہے نام

دن ہوئے پر تُو کہیں ہوتا کسی بھی شکل میں
جاگ کر خوابوں نے تیرا' رات بھر رکھا ہے نام

○

زندگی سے بہت ہی بدظن ہیں
کاش! اک بار مر گئے ہوتے

مرہمِ یاس یاد ہی نہ رہا
اب تلک زخم بھر گئے ہوتے

اجتہادِ جنوں سے کیا پایا
سب جدھر تھے، اُدھر گئے ہوتے

غیر کے دل میں گر اُترنا تھا
میرے دل سے اُتر گئے ہوتے

پائے کوبانِ فرشِ لالہ و گل
ہر دمِ نیشتر گئے ہوتے

وقت پر رازداں نے زہر دیا
چارہ گر، کام کر گئے ہوتے

میرے وحشت کدے میں کیوں آئے
بلخ و کاشغر گئے ہوتے

بار بار اُس نے دی تھیں آوازیں
سوچتے میں بسر گئے ہوتے

نہ ملا ہم کو وقتِ شانہ کشی
کتنے گیسو سنور گئے ہوتے

○

اسی میں ہو چکا' اب کیا نہ چاہوں
سزا ہونے کی ہے' ہونا نہ چاہوں

تُو میرے بعد رکھے گا مجھے یاد
میں اپنے بعد اک لمحہ نہ چاہوں

جدھر دیکھو اُدھر بے پردگی ہے
کدھر دیکھوں کہ میں پردہ نہ چاہوں

لبوں پہ ہے بپا حَرفوں کی محفل
ابھی گفتار میں آیا نہ چاہوں

جہانِ دید میں نایاب ہو جا
مری جاں! میں تجھے بچھڑا نہ چاہوں

ہیں سب رستے پشیمانی کے رستے
میں چلتا جاؤں' پر رستہ نہ چاہوں

نہ کوئی چاپ زندہ ہے' نہ دستک
تو کیا میں گھر میں دروازہ نہ چاہوں

ہے اب تو سامنے تیرا اک انبوہ
بھلا اب کیوں ترا آنا نہ چاہوں

خیالیں کتنے ہیں یہ شب کے انداز
کہیں میں کوئی اندازہ نہ چاہوں

وہ بیٹھا ہے دریچے بند کر کے
میں دیواروں کو بے پروا نہ چاہوں

جو بولے جاؤ تو رشتے سنیں گے
سو کیا چاہوں جو چپ رہنا نہ چاہوں

چلا ہونٹوں سے مرغولہ دھویں کا
ٹھہر جا! میں ابھی مرنا نہ چاہوں

سخن کی موت ہے یارو سخن بیچ
میں بستی میں کوئی لب وا نہ چاہوں

جو اگلے پل تلک جینا ہوا تب
بھلا کیسے کوئی وعدہ نہ چاہوں

نہ کیوں چیخوں کہ ہے اک شور برپا
بھلا میں، اور سناٹا نہ چاہوں۔

○

یہاں تابِ سخن ہے، کچھ نہ کہیو
بڑا بیگانہ پن ہے، کچھ نہ کہیو

لیا ہے اک بچن دل نے زباں سے
زباں سے یہ بچن ہے، کچھ نہ کہیو

پسِ لب تک ہے آبادی سخن کی
وہاں سے ہُو کا بن ہے، کچھ نہ کہیو

نہ کہنا تک یہاں کہنا نہ ٹھیرا
مری اب یہ کہن ہے، کچھ نہ کہیو

بھلا رونا اور اس پر خون رونا
تن آسانی کا فن ہے، کچھ نہ کہیو

○

غم ہے دل کے حساب کا جاناں
وہ جو سب کچھ تھا کیا ہوا جاناں

تم ہو آغوش میں مگر پھر بھی
دل نہیں لگ رہا مرا جاناں

میں بھی کچھ بھی نہیں تھا اور تم بھی
یعنی جو کچھ تھا، خواب تھا جاناں

شہرِ تعبیر ہو گیا آباد
خواب برباد ہو گیا جاناں

میں نے کیا کچھ کہا نہیں معلوم
تم جو ہو تم نے کیا سُنا جاناں

ہم نے سمجھا تھا جس کو رشتۂ جاں
کسی لمحے کا حال تھا جاناں

یہ نہ پوچھو بچھڑ کے تم سے مجھے
کے برس اس کا غم رہا جاناں

ہم ہیں محرومِ وسعتِ یک گام
میر کو لکھنو مِلا جاناں

کیا سنائیں تمہیں حکایتِ دل
ہم کو دھوکا دیا گیا جاناں

ہے خدا سے مناظرہ درپیش
آ گیا کون تیسرا جاناں

ہے وہ غربت کہ اب مرے دل میں
کچھ نہیں ہے مرے سوا جاناں

اسی عالم میں مبتلا ہوں میں
وہ جو عالم ہے شہر کا جاناں

کس سے ہم اپنے دل کی بات کریں
شہرِ دلّی نہیں رہا جاناں

ہم وہاں ہیں ہمارے ساتھ جہاں
میرؔ بھی خون تھوکتا جاناں

کیا غمِ ہجر اور عیشِ وصال
اِک تماشا ہوا کیا جاناں

کیا بتاؤں ہے کتنی پُر احوال
حالتِ ترکِ مدّعا جاناں

اب ہمیں زندگی گزارنی ہے
یعنی وہ کھیل ہو چکا جاناں

کاش! تم سچ کے حال میں ہوتے
اور میں جھوٹ بولتا جاناں

ہم کو گرداب میں ہے اک اُمید
پر کہیں بھی نہیں خدا جاناں

میں بھی اب بے گلہ ہوں اور تم بھی
یعنی کچھ بھی نہیں بچا جاناں

مجھ پہ اور تم پہ جس کا تھا احساں
کل وہ قاصد بھی مر گیا جاناں

○

نشاطِ شوق کے صد شوقِ بے مآل کے لوگ
عجب تھے وہ طربِ آرزو ملال کے لوگ

گنوا دیا انھیں تُو نے جمالِ مستی میں
جمالِ مست مِلے تھے تجھے کمال کے لوگ

گنوا کے اب جنھیں گُم ہے نظر کی بیداری
وہ ایک خواب کی محفل تھی اور خیال کے لوگ

رہے جواب کی آمادگی سے بے سروکار
عجب ہی لوگ تھے، سرمستئ سوال کے لوگ

نہ جانے کیا تھی وہ اک پُر کرشمہ بے نگہی
کہ جس کے سحر سے ممکن ہوئے محال کے لوگ

ترا ہی گر ترے آغوش میں رہا نہ خیال
ترے خیال میں ہوں گے، ترے خیال کے لوگ

○

گفتگو جب محال کی ہو گی
بات اس کی مثال کی ہو گی

زندگی ہے خیال کی اک بات
جو کسی بے خیال کی ہو گی

تھی جو خوشبو صبا کی چادر میں
وہ تمہاری ہی شال کی ہو گی

نہ سمجھ پائیں گے وہ اہلِ فراق
جو اذیت وصال کی ہو گی

دل پہ طاری ہے اک کمال خوشی
شاید اپنے زوال کی ہو گی

جو عطا ہو وصالِ جاناں کی
وہ اُداسی کمال کی ہو گی

آج کہنا ہے دل کو حال اپنا
آج تو سب کے حال کی ہو گی

ہو چکا میں، سو فکر یاروں کو
اب مری دیکھ بھال کی ہو گی

اب خلش کیا فراق کی اس کے
اک خلش ماہ و سال کی ہو گی

کفر و ایماں کہا گیا جس کو
بات وہ خدّ و خال کی ہو گی

جونؔ دل کے ختن میں آیا ہے
ہر غزل اک غزال کی ہو گی

کب بھلا آئے گی جواب کو راس
جو بھی حالت سوال کی ہو گی

O

انقلاب ایک خواب ہے، سو ہے
دل کی دنیا خراب ہے، سو ہے

رہیو تو یونہی محوِ آرائش
باہر اک اضطراب ہے، سو ہے

تر ہے دشت اس کے عکسِ منظر سے
اور خود وہ سراب ہے، سو ہے

جو بھی دشتِ طلب کا ہے پس رَو
وہی زرّیں رکاب ہے، سو ہے

شیخ صاحب لیے پھریں تیغہ
برہمن فتحیاب ہے، سو ہے

دہر آشوب ہے سوالوں کا
اور خدا لاجواب ہے، سو ہے

اس شبِ تیرۂ ہمیشہ میں
روشنی ایک خواب ہے، سو ہے

○

دید کی ایک آن میں کارِ دوام ہو گیا
وہ بھی تمام ہو گیا، میں بھی تمام ہو گیا

اب میں ہوں اک عذاب میں اور عجب عذاب میں
جنتِ پُر سکوت میں، مجھ سے کلام ہو گیا

آہ! وہ عیشِ رازِ جاں، ہائے! وہ عیشِ رازِ جاں
ہائے! وہ عیشِ رازِ جاں، شہر میں عام ہو گیا

رشتۂ رنگِ جاں مرا، نکہتِ ناز سے تری
پختہ ہوا اور اس قدر، یعنی کہ خام ہو گیا

پُوچھ نہ وصل کا حساب' حال ہے اب بہت خراب
رشتۂ جسم و جاں کے بیچ ' جسم حرام ہو گیا

شہر کی داستاں نہ پُوچھ' ہے یہ عجیب داستاں
آنے سے شہریار کے شہر غلام ہو گیا

دل کی کہانیاں بنیں' کوچہ بہ کوچہ' کو بہ کو
سہہ کے ملال شہر کو' شہر میں نام ہو گیا

جونؔ کی تشنگی کا تھا خوب ہی ماجرا کہ جو
مینا بہ مینا' مے بہ مے' جام بہ جام' ہو گیا

ناف پیالے کو ترے' دیکھ لیا مغاں نے جان
سارے ہی میکدے کا آج' کام تمام ہو گیا

اُس کی نگاہ اُٹھ گئی اور میں اُٹھ کے رہ گیا
میری نگاہ جھک گئی اور سلام ہو گیا

○

شوق کا بار اُتار آیا ہوں
آج میں اُس کو ہار آیا ہوں

اُف! مرا آج میکدے آنا
یوں تو میں کتنی بار آیا ہوں

دوستو! دوست کو سنبھالا دو
دُور سے پافگار آیا ہوں

صفِ آخر سے لڑ رہا تھا میں
اور یہاں لاش وار آیا ہوں

وہی دشتِ عذابِ مایوسی
وہیں انجامِ کار آیا ہوں

○

ہوں میں احوال فراموش، مرے ساتھ رہو
آج سچ مچ ہوں میں بے ہوش، مرے ساتھ رہو

میری مستی کو ہے آغوشِ محبت کی ہوس
اور نایاب ہے آغوش، مرے ساتھ رہو

اے مرے ہم نفسانِ روشِ نیم شبی!
ہو چکی بادۂ سرجوش، مرے ساتھ رہو

بس سنے جاؤ، تمہاری ہی کہے جاؤں گا
میرے یارو! ہمہ تن گوش، مرے ساتھ رہو

خوابِ کی شب کا ہوں میں بھی تو بس اک خوش گفتار
خواب کے شہر میں خاموش، مرے ساتھ رہو

کیا خبر راہ میں مجھ سے کوئی سر ٹکرا دے
ہوں گے کچھ اور بھی مدہوش، مرے ساتھ رہو

پی کے آیا تھا میں پھر ساتھ تمہارا بھی دیا
میکشو! تم کہ ہو کم نوش، مرے ساتھ رہو

وعدۂ شام کا مطلب ہے سحر کا وعدہ
وہ ہے اک وعدہ فراموش، مرے ساتھ رہو

تم مرے ساتھ رہو مست خیالو! تم کو
فکرِ فردا، نہ غمِ دوش، مرے ساتھ رہو

○

اُس گلی کچھ بھی کر نہیں اُٹھتے
بیٹھ کر عمر بھر نہیں اُٹھتے

شہر سے جبر اُٹھے گا کیسے بھلا
اُٹھتے ہیں لوگ، پر نہیں اُٹھتے

تُو میاں دل کو اندر آ کے دیکھ
یوں کرایے پہ گھر نہیں اُٹھتے

تجھ محلّے کو یہ ہوا کیا ہے
واں سے اب نامور نہیں اُٹھتے

شاید اپنا نہیں کوئی فردا
ہم میں آشفتہ سر نہیں اُٹھتے

وقت کا رَن بھی اک تماشا ہے
پاؤں اُٹھتے ہیں، سر نہیں اُٹھتے

حالت احوال کیا بتائیں کہ ہم
اُٹھنے لگتے ہیں، پر نہیں اُٹھتے

سیل لے جائے گا بہا کے تمہیں
تم یہاں سے اگر نہیں اُٹھتے

○

وہی دیوار ہے اپنی ' وہی دَر ہے درپیش
کیسے ٹھیروں میں یہاں ' پھر وہی گھر ہے درپیش

رنگ ہاتھوں سے ہر اک گام ٹٹولو اب تو
خاک منظر نظر آئے کہ نظر ہے درپیش

رخصت اے ہمسفرو! دُور ہے منزل میری
ذات سے ذات تلک مجھ کو سفر ہے درپیش

ناف پیالے کی ہوس میں نہ بھلا دوں اُس کو
سر لپستاں سے جو تا زیرِ کمر ہے درپیش

درمیانِ دو نفس مرحلے ایسے ہیں کہ بس
کوئی مشکل نہیں درپیش، مگر ہے درپیش

عرض جب دیدۂ بینا نے کیا شوقِ نگہ
عذرِ بینائی یہ تھا، خونِ جگر ہے درپیش

جاں نثاروں کے میں نرغے میں ہوں اے تیغِ عدو!
سَر بھلا کیسے بچاؤں کہ سپر ہے درپیش

قافلہ ہے کہ اب آگے نہیں بڑھنے پاتا
سخت ہموار کوئی راہگور ہے درپیش

○

میں نہ کسی یقیں میں ہوں اور نہ کسی گماں میں ہوں
محتبیانِ شہر کے قافلۂ زیاں میں ہوں

کون منائے گا یہاں جشنِ جلوسِ خسرواں
تُو بھی شکستگاں میں ہے، میں بھی شکستگاں میں ہوں

کاش! تجھے سُنا سکیں، ہم کوئی مژدۂ حیات
ہاں میں بلاکشوں کے ساتھ جادۂ امتحاں میں ہوں

کتنے شریر ہیں ترے شہر کے لوگ اے نگار!
حشر گلی میں ہے بپا، میں جو تری اماں میں ہوں

تُو نے جو مجھ کو داد دی، اُس پہ میں خوش نہیں کہ میں
نغمگیانِ محفلِ عشرتِ دیگراں میں ہوں

○

ہر جائے سے واپس آ سکے ہم
پر خود سے کہیں نہ جا سکے ہم

اب یاد ہی اس کی لیجیے آپ
کچھ بھی تو نہیں بچا سکے ہم

اب آپ اسے زہر خند کہہ لیں
اتنا تو ہے، مسکرا سکے ہم

یہ شکوۂ جبر ناروا ہے
سب کچھ تو یہاں گنوا سکے ہم

تھے طاق ہنر میں بھولنے کے
پر خود کو نہیں بھلا سکے ہم

تھی انجمنِ خیال برپا
اس سے جو نہ دل لگا سکے ہم

بازی میں نبود و بود کی جون
بس دل ہی نہیں لگا سکے ہم

رونا تو یہی ہے' زندگی میں
دھوکا ہی تو بس نہ کھا سکے ہم

کھونے کا تھا ایک کھیل جس میں
اکثر تو خدا کو پا سکے ہم

جو حاصلِ واقعہ ہے' یہ ہے
بس خود میں نہیں سما سکے ہم

○

شوق کی راہ پر اگر چلیے
چار جانب سے بے خبر چلیے

کوئی تو کارنامہ دیں انجام
اُس محلّے میں نام کر چلیے

کوے جاناں کی ناکہ بندی ہے
دلِ ہنگامہ جُو! کدھر چلیے

آرزوے وصال کا رستہ
ہے وہ رستہ کہ عمر بھر چلیے

اک عجب لہر جی میں آئی ہے
اس کی بانہوں میں جا کے مر جائیے

بیوفائی کا کچھ تو لیں بدلہ
کوئی الزام اس پہ دھر جائیے

○

مسکنِ ماہ و سال چھوڑ گیا
دل کو اُس کا خیال چھوڑ گیا

تازہ دَم جسم و جاں تھے فرقت میں
وصل، اُس کا نڈھال چھوڑ گیا

عہدِ ماضی جو تھا عجب پُر حال
ایک ویران حال چھوڑ گیا

ژالہ باری کے مرحلوں کا سفر
قافلے، پائمال چھوڑ گیا

دل کو اب یہ بھی یاد ہو کہ نہ ہو
کون تھا ' کیا ملال چھوڑ گیا

میں بھی اب خود سے ہوں جواب طلب
وہ مجھے ' بے سوال چھوڑ گیا

○

رنج ہے حالتِ سفر، حالِ قیام رنج ہے
صبح بہ صبح رنج ہے، شام بہ شام رنج ہے

اُس کی شمیمِ زُلف کا کیسے ہو شکریہ ادا
جب کہ شمیم رنج ہے جب کہ مشام رنج ہے

صید تو کیا کہ صید کار خود بھی نہیں یہ جانتا
دانہ بھی رنج ہے یہاں یعنی کہ دام رنج ہے

معنیٔ جاودانِ جاں کچھ بھی نہیں مگر زیاں
سارے کلیم ہیں زبوں، سارا کلام رنج ہے

بابا الف مری نمود، رنج ہے آپ کے بقول
کیا مرا نام بھی ہے رنج، ہاں ترا نام رنج ہے

کاسہ گداگری کا ہے، ناف پیالہ یار کا
بھوک ہے وہ بدن تمام، وصل تمام رنج ہے

جیت کے کوئی آئے تب، ہار کے کوئی آئے تب
جوہرِ تیغ شرم ہے اور نیام رنج ہے

دل نے پڑھا سبق تمام، بُود تو ہے قلق تمام
ہاں مرا نام رنج ہے، ہاں ترا نام رنج ہے

پیکِ قضا ہے دم بہ دم، جونؔ قدم قدم شمار
لغزشِ گام رنج ہے، حُسنِ خرام رنج ہے

بابا الف نے شب کہا، نشہ بہ نشہ کر گلے
جرعہ بہ جرعہ رنج ہے، جام بہ جام رنج ہے

آن پہ ہو مدار کیا بُود کے روزگار کا
دم ہمہ دم ہے دُوں بہ دم، وہم دوام رنج ہے

رزم ہے خون کا ہدر، کوئی بہائے یا بہے
رستم و زال ہیں ملال، یعنی کہ سام رنج ہے

سرِ شام ایسی ہوا چلی تری یاد، یار مہک اُٹھی
مری جو بہار خزاں ہوئی، مری وہ بہار مہک اُٹھی

کبھی سانس لی جو خیال میں، تری جلوہ گاہِ وصال میں
تو ہوائے فرقتِ شہرِ دل، سرِ رہگزار مہک اُٹھی

وہ شمیمِ قول و قرارِ جاں، مجھے آئی یاد جو ناگہاں
تو مرے وجود میں پھر کوئی، شبِ انتظار مہک اُٹھی

جو کبھی دریچۂ دل کھلا، تو وہی فضا تھی وہی صبا
تو وہی تنفسِ رنگ تھا، نظر ایک بار مہک اُٹھی

رَسَدِ مشامِ فراق ہے، اُسے شہرِ نکہت و ناز سے
کوئی یاد جو کبھی آ گئی، کوئی یادگار مہک اُٹھی

○

اگر چاہو تو آنا کچھ نہیں دشوار، آ نکلو
شروعِ شب کی محفل ہے مری سرکار! آ نکلو

تمہیں معلوم ہے ہم تو نہ آنے کے، نہ جانے کے
تڑپتا ہے تمہیں جی دیکھنے کو یار، آ نکلو

بھروسہ ہی نہیں تم کو کسی پر اور یہاں سب ہیں
تمہارے ساتھ آنے کے لیے تیار، آ نکلو

خرابے میں، سرِ شامِ تمنا، اے شہِ خوباں!
لگا خانہ خرابوں کا ہے اک دربار، آ نکلو

جو آنکھیں ہو گئیں محروم راتوں میں بھی خوابوں سے
ہیں دن میں بھی وہ خوابوں ہی کی جانبدار' آنکلو

تمہاری نرگسِ بیمار ہی کے آسرے پر ہیں
تمہاری نرگسِ بیمار کے بیمار' آنکلو

ہماری کیا خریداری کہ یکسر تن فگاری ہیں
زلیخاوار کیا آؤ گے' شیریں وار' آ نکلو

تمہیں ہم سے ملے گا کیا مگر ہم پھر تمہارے ہیں
ہماری قدر جانو اور یونہی بیکار' آ نکلو

اگر پوشیدہ رہنا مخبروں سے ہے تو پھر یارو!
ہماری مصلحت مانو' سرِ بازار' آ نکلو

○

کر رہا ہوں میں عمرِ فن برباد
لوگ کہتے ہیں، کام کرتا ہوں

یہ تو عالم ہے خوش مزاجی کا
گھر میں ہر شخص سے اُلجھتا ہوں

دشمنو تم کو خوف کس کا ہے
مار ڈالو کہ میں اکیلا ہوں

آپ ملتے نہیں، ملا کیجے
کیا میں یہ بات دل سے کہتا ہوں

سرِ محفل یہ حال ہے میرا
جیسے خود کو بھگا کے لایا ہوں

اُف! یہ نخوت کہ ایک دو پایہ
اس تفکر میں ہے کہ میں کیا ہوں

دل نے جاناں کو جو شب نامۂ ہجراں لِکھا
اشکِ خونیں کا چراغاں، سرِ مژگاں لِکھا

اے ہوس! میں نے تری بے سروسامانی میں
اک عجب دُکھ سے اُسے، بے سروساماں لِکھا

ہم عجب شعبدہ گر ہیں، بندھے ہاتھوں ہم نے
اس کی بانہوں سے مُلاقات کا ارماں لِکھا

میں جنوں میں بھی زباں سے کبھی غافل نہ رہا
ہاتھ کو ہاتھ، گریباں کو گریباں لِکھا

ہائے! وہ حال کہ جب جان سے جاتے ہوئے بھی
اپنے ہی آپ کو مجھ شخص نے جاناں لکھا

زلف کو اُس کی بھلا مجھ سے شکایت کیوں ہے
جو پریشاں تھا اُسے میں نے پریشاں لکھا

جب سُنا میں نے کہ ہے میرا تو خالق بھی مُحال
اس کے نام ایک ہوس نامۂ امکاں لکھا

تُو پسند آئی نہیں ہم کو مگر اس پر بھی
زندگی! ہم نے تجھے گیسوئے پیچاں لکھا

ہم نے اے عالمِ خاموشیِ جاویدِ نبود!
بُود کو تیری سماعت میں غزل خواں لکھا

○

ہے وہ گروہ اپنا جو راہ پہ نہ آیا
جینے کو جی رہے ہیں، جینا مگر نہ آیا

تم دیکھتے ہو میرا کیا حال ہو گیا ہے
پر میرے دیکھنے کو وہ بے خبر نہ آیا

ویسے میں ہوش میں ہوں پر مجھ کو غمگسارو
تم ہوش میں نہ لاؤ جب چارہ گر نہ آیا

اک شام اور گزری، اک رات اور آئی
وہ سیم تن نہ آیا، وہ سیم بر نہ آیا

یہ ہوش ہے کہ اس کی مستی پہ گفتگو تھی
بعد اس کے ہوش ہم کو پھر رات بھر نہ آیا

اب ہم کِسی کو اپنی روداد کیا سنائیں
اک عمر دِل میں رہ کر اک دن وہ گھر نہ آیا

وہ رنگ ہے تو آخر ہم کو نظر بھی آئے
وہ رنگ تھا، سو ہوگا، ہم کو نظر نہ آیا

ہر شکوہ نابجا ہے، یارو! یہ ماجرا ہے
ہم جان سے گئے، پر طورِ سفر نہ آیا

دُوری کا اب گِلہ کیا، دُوری کی عمر ساری
پل تھی جسے حسابِ شام و سحر نہ آیا

○

لازم ہے اپنے آپ کی امداد، کچھ کروں
سینے میں وہ خلا ہے کہ ایجاد کچھ کروں

ہر لمحہ اپنے آپ میں پاتا ہوں کچھ کمی
ہر لمحہ اپنے آپ میں، ایزاد کچھ کروں

روکار سے تو اپنی میں لگتا ہوں پائیدار
بنیاد رہ گئی، پئے بنیاد کچھ کروں

طاری ہوا ہے لمحۂ موجود اِس طرح
کچھ بھی نہ یاد آئے، اگر یاد کچھ کروں

موسم کا مجھ سے کوئی تقاضا ہے دَم بہ دَم
بے سلسلہ نہیں نفسِ باد، کچھ کروں

○

حال یہ ہے اب تم سے بچھڑے ہم کو ماہ و سال ہوئے
ہم تو ہیں بسمل سے تڑپتے، تم بھی کچھ بے حال ہوئے

میں جو شمال سبز گیا تھا، پیلا ہو کر لوٹا ہوں
شہروں نے وہ یورش کی ہے، سب جنگل پامال ہوئے

میری محبت تیری رقیبی، دونوں کا تھا ایک نصیب
اس کی گلی کو چھوڑ کے ہم تم، دونوں بے اقبال ہوئے

میرا اپنا طور عجب تھا ورنہ اس کے کوچے میں
میرے سوا سارے ہی ہنرور، کتنے مالامال ہوئے

کتنے بگولے بیچ میں اُٹھے ' حالِ گرد افشانی میں
آئینے پر زنگ وہ آیا ' ہم سب بے تمثال ہوئے

سُود و زیاں کی بات ہی کیا ہے ' سُود و زیاں کی بات بھی کیا
تم شاخوں کی کونپل ٹھیرے ' ہم پیڑوں کی چھال ہوئے

شوق نے جب سے بستی چھوڑی ' اپنی پُر احوالی کی
سارے غمزے جھوٹے نکلے ' سب عشوے جنجال ہوئے

ہم میدانِ شکستِ جاں کی کیا روداد کہیں تم سے
تیغِ دو دم تھے یار ہمارے ' ہم یاروں کی ڈھال ہوئے

مر کے بھی کچھ کم تو نہیں تھا اپنا سوزِ زخمِ جگر
پر تم مجھ سے کچھ مت پوچھو ' جو حملے اِمسال ہوئے

○

دلِ برباد کو آباد کیا ہے میں نے
آج مدت میں تمہیں یاد کیا ہے میں نے

ذوقِ پروازِ تب و تاب عطا فرما کر
صید کو لائقِ صیاد کیا ہے میں نے

تلخیٔ دورِ گزشتہ کا تصور کر کے
دل کو پھر مائلِ فریاد کیا ہے میں نے

آج اس سوزِ تصور کی خوشی میں اے دوست!
طائرِ صبر کو آزاد کیا ہے میں نے

ہو کے اصرارِ غمِ تازہ سے مجبورِ فغاں
چشم کو اشکِ تر امداد کیا ہے میں نے

تم جسے کہتے تھے ہنگامہ پسندی میری
پھر وہی طرزِ غم ایجاد کیا ہے میں نے

پھر گوارا ہے مجھے عشق کی ہر اک مشکل
تازہ پھر شیوۂ فرہاد کیا ہے میں نے

○

تُو سحر و معجزہ بھی دکھا دے مقال کا
ممکن نہیں جواب، کسی بھی سوال کا

آئے یقیں اُسی کی اذیت دہی کے ساتھ
ہم کو گمان تک نہ ہو جس احتمال کا

تُو مجھ کو مجھ سے روک رہا ہے، کمال ہے
منظر تو رُک کے دیکھ لوں اپنے زوال کا

اے ہم فضا! ودیعتِ فطرت پہ ناز کیوں
پرواز کیا ہنر ہے ترے شاہبال کا

پُرسش کا وار کِس کو، کہ ہے دُوبدو کی یاں
ہو جائے حال کیا، مرے پُرسانِ حال کا

ہم مَر بھی جائیں، نشو ونما سے نہ جائیں گے
روئیدگی پہ قرض ہے یاں بال بال کا

پُرسش تُو میری سال بہ سال اب کرے بھی کیا
اِمسال بھی ہے حال وہی پارسال کا

جو تھے وہی کوائفِ زنداں ہیں اور ہاں
اِن روزوں نرخ تیز ہے، روزن کے مال کا

اہلِ کمال کا ہے اِک انبوہ اور میں
شاعر کمال کا ہوں، نہ عاشق کمال کا

○

راز جواب تک سربستہ تھے' عنوانوں تک آپہنچے
صبحِ نو کے روشن لمحے' شب خانوں تک آپہنچے

کتنے عنواں لرزاں خیزاں' لوح و قلم تک ہیں محفوظ
کتنے عنواں خون میں غلطاں' افسانوں تک آپہنچے

مصر کے بازاروں سے کتنے یوسف آ کر لوٹ گئے
کتنے یوسف چاک بداماں' کنعانوں تک آپہنچے

کانپ رہے ہیں آہن پیکر زنجیروں کے پیچ و خم
آزادی کے دیوانے کیا' زندانوں تک آپہنچے

کتنے رستے میخانوں سے دار و رسن تک جاتے ہیں
ہاتھ ہمارے پھر بھی ساقی ' پیمانوں تک آپہنچے

آج بغاوت برپا کرنے جام و مینا اُٹھے ہیں
راز ہماری تشنہ لبی کے ' میخانوں تک آپہنچے

رنگ اور رَس کے بادل برسے ' صبحِ بہاراں جاگ اُٹھی
غنچے لے کر روپ سندیسے ' ویرانوں تک آپہنچے

○

محفل اُس شوخ کے خیال کی ہے
کیفیت ہے کہ وجد و حال کی ہے

میں ہی یہ بوئے خوش نہ پہچانوں؟
یاسمینِ سمن جمال کی ہے

صبحِ نو کی شفق تو دیکھ ذرا!
یہ جھلک اُس کی سُرخ شال کی ہے

ہے خرابے میں ایک شور بپا
گفتگو اُس کے خدّ و خال کی ہے

میرِ مجلس کو جو قبول نہیں
ساری مجلس اسی خیال کی ہے

پیر مرہم سے جس قدر ہے مجھے
ہوس اتنی ہی اندمال کی ہے

رنگ سرشار ہیں در و دیوار
اس کی انگڑائی تو کمال کی ہے

رنگ جو اب ہے رنگِ عارض کا
یہ عطا ' شوخیٔ سوال کی ہے

سیلِ خوں سے گزر دلِ مشتاق
یہی اک راہ اب وصال کی ہے

غیر کو اس یقیں سے شاد رکھو
کہ ہمیں جستجو محال کی ہے

دیکھ لوں زخم تازہ داروں کو
قوم یہ کفر کے عیال کی ہے

ہیں سرِ نخل کچھ اَناالحق مست
یہ جماعت تو اہلِ قال کی ہے

○

سخن کیوں یار ہی پر بار ٹھیرے
کوئی بزمِ سخن بے یار ٹھیرے

سواب میں بے محل ہو جاؤں خاموش
کہ خاموشی مری گفتار ٹھیرے

یہ رشتے ہیں کہ رشتوں کی شکستیں
کسی دن تو کوئی تکرار ٹھیرے

گِلہ مندوں نے اُن کو دھوپ جانا
یہاں جو سائے بے دیوار ٹھیرے

میں اُس پر جان بھی واروں تو یارو!
مرا جاں وارنا بھی وار ٹھیرے

ہماری گھر میں گنجایش کہاں تھی
کہ ہم تو گھر کے اِک معمار ٹھیرے

○

اب تو یہاں یونہی سی گزر چاہتا ہے دل
کچھ دن کے بعد خود سے سفر چاہتا ہے دل

دریائے خواب ہے کہ رواں ہے ہمیشہ میں
اور اب کسی بھی موج میں گھر چاہتا ہے دل

فتنہ تھیں سر کا دانش و دیوانگی بہم
اب تو حسابِ فہمیِ سر چاہتا ہے دل

جانے یہ حرصِ عقل ہے یا خواہشِ جنوں
دیوار میں نگاہ کی دَر چاہتا ہے دل

اس کہنہ شہر گاہِ وصال و فراق سے
اب ایک بادِ تند گزر چاہتا ہے دل

سُن لوں گا اس کی بات کہ اک بات تو ہوئی
تیرے سوا کسی کو اگر چاہتا ہے دل

اب تو ہر اعتبارِ یقین و گماں سے جونؔ
آشوبِ بے دلی میں سفر چاہتا ہے دل

اب اس کو اپنی آن کی اک آن چاہیے
ترکِ حسابِ شام و سحر چاہتا ہے دل

کوئی خبر نہیں ہے لبِ ہست و بود پر
بس اب یہی تو ایک خبر چاہتا ہے دل

ہاں یہ جہاں نہیں دل و دانش کا، ہاں نہیں
اب اس جہاں کو زیر و زبر چاہتا ہے دل

○

ہوں شہروں شہروں آوارہ، تم جانے کس شہر میں ہو
میں پھرتا ہوں مارا مارا، تم جانے کس شہر میں ہو

بس اک ویرانی پھیلی ہے "دل اندر" سے دید تلک
مجھ میں ہو کیسے میرا گزارا، تم جانے کس شہر میں ہو

اِس جانب کیا گزری آخر، اِس کی خبر تو لینی تھی
دشت ہوا "دل شہر" ہمارا، تم جانے کس شہر میں ہو

ماہ و سال گماں میں گزرے اور گماں برباد گیا
جانے کیا ہے نام تمہارا، تم جانے، کس شہر میں ہو

تم کو دیارِ جاں میں ڈھونڈا، یعنی ہم اپنی جاں سے گئے
وقت تھا غارت جاناں سارا، تم جانے، کس شہر میں ہو

○

وہ ادھر آئے لالہ کار، اے کاش
دیکھ لیں ہم بھی وہ بہار، اے کاش

یوں جوانی تباہ کرنے کا
مجھ کو ہوتا نہ اختیار، اے کاش

وصل یک حال، ہجر صد احوال
ابھی رہتا یہ انتظار، اے کاش

ہم کو بھی کوئی عذر ہاتھ آئے
ہو وہ اوروں سے ہمکنار، اے کاش

ذمہ دار وجود کوئی نہیں
کوئی مل جائے ذمہ دار، اے کاش

وحشت انگیز ہے یہ بے طرفی
ہم ہوں اپنے ہی جذبہ دار، اے کاش

○

ہم کہ دل زندہ ہیں اے نکہتِ نازاں! اب کے
نہیں چھوڑیں گے ترا گوشۂ داماں اب کے

کوچۂ زُلفِ درازاں میں رچائیں گے جنوں
دشت و صحرا میں پھریں گے نہ پریشاں اب کے

آ چلی درد کی لذت میں اب اک پیشہ وری
آزمائیں گے ذرا لذتِ درماں اب کے

ہم تری سیر گہِ رنگ میں اے رنگ خرام!
ہونے آئیں گے ترے ساتھ خراماں اب کے

کھائیں گے سینے پہ گُل' اے ہمہ تن رنگ! تو کھُل
رنگ اٹھائیں گے ترے سینہ فگاراں اب کے

جان! یہ جسم نثاروں کو جنوں ہے تیرے
ہوں ترے جسم تئیں وہ ہمہ تن جاں اب کے

رنگِ موسم کا کرایہ چڑھا خوشبوؤں پر
تھے کرایے پہ لیے رہنے کو زنداں اب کے

شہر کوچوں میں بِکا تارِ نفس کے مولوں
تیرے لوگوں کا ہر اک تارِ گریباں اب کے

نہیں مہمان سرائے کا تکلف اچھا
رکھیو اپنے ہی گھر تُو ہمیں مہماں اب کے

شیوۂ رَم نے انھیں اپنے ختن کا نہ رکھا
یاد آتے رہے گم گشتہ غزالاں اب کے

نہ تری زلف پریشان ہو اے یار! نہ ہم
بس تری زلف کی خوشبو ہو پریشاں اب کے

میں ترے در پہ لگاؤں گا کچھ اس طور صدا
دیکھیو رقص کریں گے ترے درباں اب کے

ہمہ تن رنگ ہے تُو، میں بھی عجب رنگ میں ہوں
آئے گا شہر میں اک رنگ کا طوفاں اب کے

ساز ہاتھوں میں لیے رہیو تُو اے مطربِ جاں!
آؤں گا رقص کناں تیری طرف، ہاں، اب کے

اُس کی آنکھوں کا نگاہوں کو مری ہے یہ پیام
ہوں گے افشاں کے ستارے سرِ مژگاں اب کے

تیرے خلوت سے میں اس بار نہ واپس آؤں
تُو مجھے دل میں ہی رکھ لیجیو، جاناں اب کے

خیمہ زن دل میں بھی ہے دید کی سرشار بہار
آپ ہی آپ ہیں سرکار! بہاراں اب کے

○

مجھ پہ ہے اُسے بڑا بھروسہ
فریاد! کہ بے ثبات ہوں میں

خود پر تو مجھے یقیں نہیں ہے
تم پر ہی یقین کر سکوں میں

آواز ہے ذات کا تموج
جب تک بھی ہو بولتا رہوں میں

ہے وقت حریفِ وضعِ صورت
لمحات میں ریزہ ریزہ ہوں میں

○

سارے رشتے تباہ کر آیا
دلِ برباد اپنے گھر آیا

آخرش خون تھوکنے سے میاں
بات میں تیری کیا اثر آیا

تھا خبر میں زیاں دل و جاں کا
ہر طرف سے میں بے خبر آیا

اب یہاں ہوش میں کبھی اپنے
نہیں آؤں گا، میں اگر آیا

میں رہا عمر بھر جُدا خود سے
یاد میں خود کو عمر بھر آیا

وہ جو دل نام کا تھا ایک نفر
آج میں اس سے بھی مُکر آیا

مدتوں بعد گھر گیا تھا میں
جاتے ہی میں وہاں سے ڈر آیا

○

دید حیران اُس گلی میں ہے
کیا عجب شان اُس گلی میں ہے

بات میں جان سے گزر جانا
کتنا آسان اُس گلی میں ہے

اور اک بار مجھ کو جانے دو
سارا سامان اُس گلی میں ہے

کیا خبر اِن محل نشینوں کو
اپنی جو آن اُس گلی میں ہے

کیا بتاؤں ہے کیا وہ جان گلی
میری تو جان اُس گلی میں ہے

میں کہیں بھی رہوں، کہیں جاؤں
دل کا ریحان اُس گلی میں ہے

وہی دیوار و در، وہ میرا گھر
وہی دالان اُس گلی میں ہے

میں جو کافر ہوں اُس گلی باہر
میرا ایمان اُس گلی میں ہے

اُس گلی پر ہوں جان سے قربان
میری پہچان اُس گلی میں ہے

○

گلوں پہ حسنِ رقم کا گماں گزرتا ہے
ترے نقوشِ قدم کا گماں گزرتا ہے

شبابِ دوست کی خلوت عجیب ہے کہ جہاں
سپردگی پہ بھی رَم کا گماں گزرتا ہے

ہم اُس جہاں سے تمہارے جہاں تک آئے ہیں
جہاں خوشی پہ بھی غم کا گماں گزرتا ہے

ترے قریب، ترے التفات کے باوصف
مئے نشاط پہ سَم کا گماں گزرتا ہے

مجھے جنونِ محبت کی بے نیازی پر
نیازِ جاہ و حشم کا گماں گزرتا ہے

خلوصِ میکدۂ حُسنِ یار پر بھی ہمیں
فریبِ دیر و حرم کا گماں گزرتا ہے

مرے قبولِ محبت کے بعد سے اُن کو
مرے ستم پہ کرم کا گماں گزرتا ہے

ترے سکوتِ حیا پر ہمیں کئی دن سے
قرار و قول و قسم کا گماں گزرتا ہے

ہزار "دلشکنی" پر بھی جونؔ ہے دلبر
"صنم شکن" پہ "صنم" کا گماں گزرتا ہے

○

دل کی ہر بات دھیان میں گزری
ساری ہستی گمان میں گزری

ازلِ داستاں سے اِس دَم تک
جو بھی گزری، اک آن میں گزری

جسم مدت تری عقوبت کی
ایک اک لمحہ جان میں گزری

زندگی کا تھا اپنا عیش مگر
سب کی سب امتحان میں گزری

ہائے! وہ ناوکِ گزارشِ رنگ
جس کی جنبش کمان میں گزری

وہ گدائی گلی عجب تھی کہ واں
اپنی اک آن بان میں گزری

یوں تو ہم دَم بہ دَم زمیں پہ رہے
عمر سب آسمان میں گزری

جو تھی دل طائروں کی مہلتِ بُود
تا زمیں، وہ اُڑان میں گزری

بُود تو اک تکان ہے، سو خدا!
تیری بھی کیا تکان میں گزری

○

طور یہ پسند آئے دل کو شہر والوں کے
جیب میں لیے پھریے مرحلے خیالوں کے

کیسے کیسے جھگڑے ہیں، اِس شکستہ حالی میں
ہم شکستہ حالوں سے، ہم شکستہ حالوں کے

وار کرنے والو! آؤ، آکے مرہمی فرماؤ
ہم نے زخم کھائے ہیں، جانے کتنی ڈھالوں کے

پائمال کرتے ہیں نقشِ پا ہمیں کیا کیا
اپنی پائمالی میں، اپنے پائمالوں کے

دل پہ خوش جوابی کے جانے کیا گزرتی ہو
ایک جنبشِ لب میں عیش ہیں سوالوں کے

بے گلہ گزرتی ہے، ہم گِلہ گزاروں کی
بے وطن دعاگو ہیں، بے ختن غزالوں کے

شوقِ بے مثالی میں، ہے یہ روزگار اپنا
ہیں زباں کا روزینہ، نام بے مثالوں کے

جانے کِن اندھیروں میں تم نے چھاؤنی کی ہے!
تم اُجڑنے والے تو، خواب تھے اُجالوں کے

○

مت پوچھو جو رقص کے مستوں کی تھی حالت، رات گئے
رقصِ تمنا میں برپا تھا شورِ قیامت، رات گئے

وہ حلقہ پُراحوالوں کا، یار عجب کچھ حلقہ تھا
سب کو تھی پُراحوالی میں، سب سے محبت، رات گئے

زندہ دِلوں کی فریادوں سے، جھوم رہی تھی دل محفل
سحر تھا اک حسرت مندوں کا، حرفِ شکایت، رات گئے

سب ہم محفل دھیان سے اپنے، دھیان لگائے بیٹھے تھے
دھیان کا خوش قامت کہ تھا، اپنا قامت، رات گئے

وعدہ بے میعاد تھا اُس کا اور رہی تھی رات بہت
یوں سمجھو وصلت ایسی تھی، رات کی فرقت، رات گئے

○

اپنا وہم، اپنا گماں چاہا گیا
تجھ کو اے جاناں! کہاں چاہا گیا

اپنے یاروں کے بس اِک نوکر تھے ہم
روز اک طرزِ بیاں، چاہا گیا

میں تو پلٹا آگ لے کر اور یہاں
میری جیبوں میں دھواں چاہا گیا

زندگی تھی اپنے ہونے کا گماں
اپنے ہونے کا سماں چاہا گیا

تیرہ و تاری، خلا کے درمیاں
روشنی کو بے اماں چاہا گیا

پھر کہاں تھا وصل کا امکان جب
مجھ کو میرے درمیاں چاہا گیا

رنگ تو جم کر رہا اُڑنے پہ بھی
نکہتوں کو بے نشاں چاہا گیا

*منصور زبیری کے شرابی آغوش میں

(۳۱ویں اگست ۱۹۹۴ء)

سامنے ہو کے دلنشیں ہوتا
تُو بھی اے جانِ جاں! یہیں ہوتا

تم بھی اکثر کہیں نہیں ہوتے
میں بھی اکثر کہیں نہیں ہوتا

زندگی اپنی، جستجو ہے تری
تُو جو ہے جان، تُو کہیں ہوتا

دل سے بس ایک بات کہہ دیجیو
دل کا چاہا ہوا، نہیں ہوتا

تُو قیامت کا بے مروت ہے
میں ترا ہمنشیں نہیں ہوتا

بات کرتے ہیں سنگِ در کی سبھی
کوئی خونیں جبیں نہیں ہوتا

کوئی بھی دل رُبا و دلبر ہو
دل سے بڑھ کر حسیں نہیں ہوتا

جونؔ! آغازِ مے گساری میں
نشہ ہوتا ہے' پھر نہیں ہوتا

تم نہیں چاہتے مرا ہونا
چلو اچھا ہے' میں نہیں ہوتا

قطعات

اپنی انگڑائیوں پہ جبر نہ کر
مجھ پہ یہ قہر ٹوٹ جانے دے
ہوش میری خوشی کا دُشمن ہے
تُو مجھے ہوش میں نہ آنے دے

○

تیز رو، جنگلوں کی رات اور میں
جانے اس وقت کیا بجا ہو گا
اس کی دُوری میں ہیں سفر درپیش
جو مری راہ دیکھتا ہوگا

○

پردہ داری کے ساتھ ہم دونوں
کتنے خاکوں میں رنگ بھرتے ہیں
نام لیتے ہوئے محبت کا
میں بھی ڈرتا ہوں، وہ بھی ڈرتے ہیں

○

شُند لمحوں سے ٹُوٹ پھُوٹ کے میں
تیری بانہوں میں آن پڑتا ہوں
کِن صفوں میں شریک ہو کے لڑوں
اب تو میں بس تجھی سے لڑتا ہوں

○

تھی متاعِ نشاطِ جاں یہ گلی
ہم نے کچھ دن یہاں گنوائے تھے
جانے کِس حال میں تھا میں اک شام
لوگ کچھ پُوچھنے کو آئے تھے

○

محرومی سی محرومی ہے' ناکامی سی ناکامی
غم تو دیوانہ کر دے اچھے خاصے فرزانے کو
جونؔ تو اک دیوانہ ٹھیرا اور پھر کیسا دیوانہ
دیکھو جانے کیا کر بیٹھے' روکو' اس دیوانے کو

○

انجمن کی اُداس آنکھوں سے
آنسوؤں کا پیام کہہ دینا
مجھ کو پہنچا کے لوٹنے والو
سب کو میرا سلام کہہ دینا

(۳۰ ویں دسمبر ۱۹۵۶ء اسٹیشن امروہہ)

○

سفری ہوں میں پر یہ مشکل ہے
پاس میرے، سفر کی زاد نہیں
تم مرا خواب' میری ذات تھیں تم
نام کیا ہے تمہارا' یاد نہیں

○

اے سب کے خدا ! سخن کیے جا
بہتر ہے یہی کہ میں نہ بولوں
اب ایک ہی میری آرزو ہے
وہ یہ ہے کہ کچھ بھی میں نہ سمجھوں

○

میں تو کب کا گزر چکا خود سے
تم بھی خود سے گزر تو سکتی ہو
کوئی درمانِ دل نہیں لیکن
تم مری جان! مر تو سکتی ہو

○

اُن کے رُخ کو حیا کی سُرخی کا
ایک پیغام آنے والا ہے
بس وہ گھبرائے ، بس وہ شرمائے
اب مرا نام آنے والا ہے

○

بجا کہ ہم بھی یہیں آئے ہیں یہیں واعظ
مگر جناب تو پہلے سے آئے بیٹھے ہیں
حسابِ سُود وزیاں ہم سے کیا اور اب کیا بولیں
کہ ہم وہ ہیں جو تمہیں بھی گنوائے بیٹھے ہیں

○

میں سوچتا ہوں کہ تیرے شبابِ زرّیں میں
ہنر نمائیِ تزئین کے سِوا کیا ہے
ذرا بتا تو سہی ' اے حسینۂ زرکار!
کہ تیرا حُسن حیاتین کے سِوا کیا ہے

○

جانے کیوں محسوس ہوتا ہے مجھے
میں بہت کمزور ہوں اس شہر میں
ہو سکا اب تک نہ میرا فیصلہ
کب سے زیرِ غور ہوں اس شہر میں

○

اب میں سمجھا ہوں بیکسی کیا ہے
اب تمہیں بھی مرا خیال نہیں
ہائے! یہ عشق کا زوال کہ اب
ہجر میں ہجر کا ملال نہیں

○

اے رفیقانِ انکسار پسند!
جارحیت سے میں نے کام لیا
ان حسینانِ قصرِ دولت سے
میں نے تم سب کا انتقام لیا

○

رشتۂ دل ترے زمانے میں
رسم ہی کیا نباہنی ہوتی
مُسکرائے ہم اُس سے ملتے وقت
رو نہ پڑتے اگر خوشی ہوتی

نظمیں

زمان

آسمانوں میں خداوند ازل سے گُم تھا
آسمانوں کے تحیّر کی فراخی کا سکوت
سوچتا تھا کہ خداوند کہاں ہے آخر؟
اور اِس سوچ نے اُس ''دیر'' کو آغاز کیا
اور اِس ''دیر'' نے اُس ''زور'' کو آغاز کیا
جو زماں ہے' جو خداوند کی نابودی ہے

قاتل

سُنا ہے تم نے اپنے آخری لمحوں میں سمجھا تھا
کہ تم میری حفاظت میں ہو، میرے بازوؤں میں ہو
سُنا ہے بجھتے بجھتے بھی تمہارے سرد و مُردہ لَب سے
ایک شعلہ، یاقوت فام و رنگ و اُمّیدِ فروغِ زندگی آہنگ لپکا تھا
''ہمیں خود میں چھپا لیجیے''
یہ میرا وہ عذابِ جاں ہے جو مجھ کو
مرے اپنے خود اپنے ہی جہنم میں جلاتا ہے

○

تمہارا سینۂ سیمیں
تمہارے بازوانِ مرمریں
میرے لیے
مجھ اک ہوس ناک فرومایہ کی خاطر
"سازوسامانِ نشاط و نشۂ عشرت فزونی" تھے
مرے عیاش لمحوں کی فسوں گر پُر جنونی کے لیے
صد لذّت آگیں صد کرشمہ پُر زبونی تھے

○

تمہیں میری ہوَس پیشہ
مری سفاک' قاتل بے وفائی کا گماں تک
اُس گماں کا ایک وہمِ خود گریزاں تک نہیں تھا
کیوں نہیں تھا' کیوں نہیں تھا' کیوں؟
کوئی ہوتا' کوئی تو ہوتا
جو مجھ سے مری سفاک قاتل بے وفائی کی سزا میں
خون تھکواتا
مجھے ہر لمحے کی سُولی پہ لٹکاتا
مگر فریاد! کوئی بھی نہیں' کوئی......

دریغ اُفتاد کوئی بھی……

O

مجھے مفرور ہونا چاہیے تھا
اُور مَیں سفاک، قاتل، بے وفا، خوں ریز تر، مَیں
شہر میں خود واردات، شہر میں خودمست، آزادانہ پھرتا ہوں
نگارِ خاک آسودہ!
بہارِ خاک آسودہ!

اے شہر! تیرے اہلِ قلم بے ضمیر ہیں

اے شہر! تیرے اہلِ قلم بے ضمیر ہیں
ہم جو عظیم لوگ ہیں، ہم بے ضمیر ہیں

اے دخترانِ شوخ و بدن صندلینِ شہر
ہم لوگ التفات کے قابل۔ نہیں، نہیں
زنہار ہم کو وصل سے کرنا نہ شاد کام
ہم حُسن کی زکات کے قابل۔ نہیں، نہیں

ہم سب تمہارے سر کی قسم، بے ضمیر ہیں
اے شہر! تیرے اہلِ قلم بے ضمیر ہیں

ہم کاذبوں کی بات کا کیا خاک اعتبار
اپنی ہر اک غزل میں رواں ہیں بہ سوئے دار
یوں دیکھیے تو دیر و حرم سے ہمیں ہے عار
در پردہ ہم ہیں دیر و حرم کے وظیفہ خوار

ہم باغیانِ دیر و حرم، بے ضمیر ہیں
اے شہر! تیرے اہلِ قلم بے ضمیر ہیں

روحِ عوام، زخم سہے، ہم غزل کہیں
اک شہر سوگوار رہے، ہم غزل کہیں
اک خلق اپنا درد کہے، ہم غزل کہیں
محنت کشوں کا خون بہے، ہم غزل کہیں

کیا رہ گیا ہمارا بھرم، بے ضمیر ہیں
اے شہر! تیرے اہلِ قلم بے ضمیر ہیں

ہم اک عجب غرور سے لے کر ادب کا نام
اے سامعین! تم پہ مسلط ہیں صبح و شام
ہو بولنے کا وقت تو گونگے بنے رہیں
اہلِ سخن ہیں اور سخن کے نمک حرام

ہم دم بھریں گے فن کا' یہ دَم؟ بے ضمیر ہیں
اے شہر! تیرے اہلِ قلم بے ضمیر ہیں

باطل پرست' حرفِ انا الحق کے سود خوار
ہم بیچ کھائیں سرمد و منصور کے مزار
بعد از وقوعِ واقعہ سینہ زنی میں طاق
پُرسہ جو دو تو سارے زمانے کے سوگوار

ہم ماہرانِ پیشۂ غم' بے ضمیر ہیں
اے شہر! تیرے اہلِ قلم بے ضمیر ہیں

ہم نسل سے ہیں ابنِ بطوطہ کی بالیقیں
روداد ہم سے چین کی' ماچین کی سُنو
یہ مت سُنو کہ شاہ کا بندوں سے کیا ہے طور
تعریف صرف شاہ کے آئین کی سُنو

یہ داد اپنے حق سے ہے کم' بے ضمیر ہیں
اے شہر! تیرے اہلِ قلم بے ضمیر ہیں

یہ ناقدینِ شعر' ادب کے معلمین
اکثر غلط ہو جن کا تلفظ بھی قارئین

یہ لوگ آسمان و زمیں میں کہیں نہ ہوں
اُگلے جو آسمان تو نگلے اُنھیں زمین

تفصیل کیا کروں میں رقم، بے ضمیر ہیں
اے شہر! تیرے اہلِ قلم بے ضمیر ہیں

میں شہرِ امتحاں میں پھرا ہوں گلی گلی
اہلِ وفا کے ساتھ گیا ہوں گلی گلی
تھی جن کو فرطِ شوق میں مقتل کی جستجو
میں ان کے ساتھ ساتھ رہا ہوں گلی گلی

غائب تھے اُن کے نقشِ قدم، بے ضمیر ہیں
اے شہر! تیرے اہلِ قلم بے ضمیر ہیں
ہم جو عظیم لوگ ہیں، ہم بے ضمیر ہیں

ایک گروہ

ایک گروہ ہے کہ ہے، بے خضر اور بے سفر
ایک بُریدہ پا نمود، ایک بُریدہ سر وجود
اپنے سوال کا زیاں، اپنے جواب کا ضرر
بارِ زمیں ہے اور، ہے بارِ زماں ہے اور
خوں شدگی کی اشتہا، زرد و زبون و پُرزیاں
خونِ ہدر کا ریمیاہ خوار و خزندہ و خجل
خون نہیں ہے کوئی لوح، خون نہیں کوئی قلم
خون نہیں کوئی قضا، خون نہیں کوئی قدر
خون کوئی خدا نہیں، جو کبھی رائیگاں نہ جائے

نقشِ کہن

شانوں پہ کس کے اشک بہایا کرینگی آپ
رُوٹھے گا کون، کس کو منایا کرینگی آپ

وہ جا رہا ہے صبحِ محبت کا کارواں
اب شام کو کہیں بھی نہ جایا کرینگی آپ

اب کون "خود پرست" ستائے گا آپ کو
کس "بے وفا" کے ناز اُٹھایا کرینگی آپ

پہروں شبِ فراق میں تاروں کو دیکھ کر
شکلیں مٹا مٹا کے بنایا کریں گی آپ

گمنام اُلجھنوں میں گزارینگی رات دن
بیکار اپنے جی کو جلایا کریں گی آپ

اب ''لذتِ سماعتِ رہروؔ'' کے واسطے
اُونچے سُروں میں گیت نہ گایا کریں گی آپ
ہمجولیوں کو اپنی بسوزِ تصورات
ماضی کے واقعات سُنایا کریں گی آپ
اب وہ شرارتوں کے زمانے گزر گئے
چونکے گا کون، کس کو ڈرایا کریں گی آپ
فرقت میں دورِ گوشہ نشینی بھی آئے گا
ملنے سہیلیوں سے نہ جایا کریں گی آپ
غصّے میں نوکروں سے بھی اُلجھیں گی بار بار
معمولی بات کو بھی بڑھایا کریں گی آپ
پھر اِس کے بعد ایک وہ منزل بھی آئے گی
دل سے مرا خیال ہٹایا کریں گی آپ
حالاتِ نو بہ نو کے مسلسل ہجوم میں
کوشش سے اپنے جی کو لگایا کریں گی آپ
آئے گا پھر وہ دن بھی تغیر کے دور میں
دل میں کوئی خلش ہی نہ پایا کریں گی آپ
''نقشِ کہن'' کو دل سے مٹانا ہی چاہیے
گزرے ہوئے دنوں کو بھلانا ہی چاہیے

اُن کا جواب

جب آپ کو قریب نہ پایا کروں گی میں
رُوٹھوں گی خود سے، خود کو منایا کروں گی میں
اب میرے آنسوؤں کی پناہیں نہیں رہیں
اب اپنے آنسوؤں کو چھپایا کروں گی میں
رخصت ہوا ہے ''صبحِ محبت کا کارواں''
اب کِس کے پاس شام کو جایا کروں گی میں؟
ہاں ''وہ شرارتوں کے زمانے گزر گئے''
اب حسرتوں کے داغ اُٹھایا کروں گی میں
ہاں اب کسی ''سماعتِ ہمسایہ'' کے لیے
اُونچے سُروں میں گیت نہ گایا کروں گی میں

مطلب ہی اب نہیں ہے کسی بات سے مجھے
اب بات بات کو نہ بڑھایا کروں گی میں
"انجام" کے اُداس اندھیروں میں بیٹھ کر
"آغاز" کے چراغ جلایا کروں گی میں
ہمجولیوں کو اپنی بسوزِ تصورات!!
ماضی کے واقعات سُنایا کروں گی میں
حیرت ہے آپ کا مرے بارے میں یہ خیال
دل میں کوئی خلش ہی نہ پایا کروں گی میں؟
شکلیں بنا بنا کے مِٹایا کریں گے آپ
شکلیں مِٹا مِٹا کے بنایا کروں گی میں؟
حالات سے نباہ' یہ کیا کر رہے ہیں آپ!!
حالات کا مذاق اُڑایا کروں گی میں؟
کیا ہو گئے ہیں آپ بھی کچھ مصلحت پسند!!
کیا اب فریبِ ہجر ہی کھایا کروں گی میں؟
کیا اضطرابِ روح بھی برباد جائے گا!!
کیا یونہی اپنے دل کو جلایا کروں گی میں؟
ہے اس روش کا نام اگر زندگی تو پھر!!
خود زندگی کو بحث میں لایا کروں گی میں؟

بس آپ ہی نہ دیجیے یہ مشورے مجھے
ہیں اور بھی ستم جو اُٹھایا کروں گی میں
"نقشِ کہن" کو دل سے مِٹایا نہ جائے گا
گزرے ہوئے دنوں کو بھلایا نہ جائے گا

انبوہ

ایک بستی ہے، آدمی ہیں دو
ایک تو میں ہوں، اور دوسرا میں
گھر سے نکلا ہوں، دیکھیے کیا ہو
محترم! دیکھ کر اچھالا کیجیے

صفازادہ

ابنِ شاذان مسجد سے باہر نکل کر
گلوگیر آواز میں مجھ سے گویا ہوا:
یا اخی! میں زنازادہ ہوں

میں ٹھہر کے' اسے آئینہ وار تکنے لگا
اُمِ فروہ کی بغلوں کی خوشبو کی سوگند
میرا عجب حال تھا

ہاں' میں ہوں...... یا اخی! میں زنازادہ ہوں
اُس نے دُسرا کے مجھ سے کہا

اور پھر وہ جو رویا ہے...... بس کیا کہوں
اتنا رویا کہ ریشِ سیہ اُس کی اشکوں سے تر ہو گئی

ہم ذرا دیر کے بعد آگے بڑھے
رات تاریک تھی
سُوقِ علاف کے چوک تک اُس کی آواز روتی رہی
اور میں تھا کہ افسردہ دل اور خاموش
اُس کو سہارا دیے چل رہا تھا

ازاں بعد میں نے تکلّم کیا
یا اخی! تُو زنازادہ ہرگز نہیں
تُو صفازادہ ہے
پر تجھے اپنی مادر کے حق کی قسم
تُو کبھی ایسا دعوا نہ کیجو
کہ جس کی عقوبت میں
تجھ کو صلیب اپنی خود ہی اٹھانی پڑے

وہ مری بات سنتے ہی یک دم رُکا
اب کچھ ایسا تھا جیسے وہ حاضر بھی ہو اور غائب بھی
پھر چپ و راست اُس نے کچھ اِس طور دیکھا
کہ میں کچھ اُلجھ سا گیا
جانیے کیوں!
مجھے اُس کی آنکھوں میں بیگانگی سی نظر آ رہی تھی
ازاں بعد وہ قہقہہ مار کر مجھ کو تکنے لگا

میں نے دیکھا
تو کیا دیکھتا ہوں
کہ اب اُس کے چہرے پہ آنکھیں نہیں ہیں
وہاں دو بھڑکتے ہوئے شعلے ہیں
اور میں ڈر گیا

شہید چوک کے نام

شہید چوک! شکاگو ترا سلامی ہے
میں تیری خاک کو تعظیم دینے آیا ہوں
دیارِ وقت کی خوں گشتہ محنتوں کے لیے
میں تیرے خون کا پیغام لینے آیا ہوں

○

ابھی سے زرد ہے چہرہ نظامِ دولت کا
ابھی تو جوشِ بغاوت کو عام ہونا ہے
شہید چوک! ترے ولولے جوان رہیں
ابھی تو رسمِ شہادت کو عام ہونا ہے

○

سیاہ رات! وہ سُورج اُبھرنے والا ہے
جو انقلاب کا پرچم فضا میں کھولے گا
زمین، حشر اُٹھائے گی ظالموں کے خلاف
یہ خون چُپ نہ رہے گا، یہ خون بولے گا

○

سُنو کہ ظلم کی دیوار گرنے والی ہے
وہ دور آکے رہے گا، وہ دور آئے گا
چھڑی ہوئی ہے لڑائی اور اس لڑائی میں
شہیدچوک! ترا خون فتح پائے گا

تمنّا

ہر نفَس، سوزِ تمنا سے عبارت ہے وجود
کربِ صد گونہ تمنا کی حکایت ہے وجود
نغمۂ وقت اک آہنگِ تمنا ہی تو ہے
یعنی جو کچھ ہے وہ نیرنگِ تمنا ہی تو ہے
زندگی یوسفِ فطرت کی زلیخائی ہے
اک تمنا ہے کہ خود اپنی تمنائی ہے
یہ مشیّت تھی کہ آدم کو سزا دی جائے
یعنی دیوانے کی وحشت کو ہوا دی جائے
شوقِ سرگشت کو سرگشتۂ مقسوم کیا
دل کے صفحے پہ تمناؤں کو مرقوم کیا

دلِ کی تقدیر ہے مجبورِ تمنّا ہونا
ہر نفَس، تازہ تمنّا کا خودآرا ہونا
اس تسلسل میں کہیں وقفۂ آرام نہیں
ایک آغازِ مسلسل ہے اور انجام نہیں
اس تسلسل کو بدلنے کی تمنّا ہے مجھے
جبر کی حد سے نکلنے کی تمنّا ہے مجھے

....

رُوح آزاد ہو، مجبورِ تقاضا نہ رہے
ہے تمنّا کہ مجھے کوئی تمنّا نہ رہے

ہجوِ معشوقانِ خود

یہ جو معشوق ہیں مرے دو چار
بدکنش ، بدکلام ، بدکردار
کیسا بدصوت لفظ ہے معشوق
ہے قوافی میں جس کے اک مغلوق
یہ مرا جبر ہیں ضرورت ہیں
میں کہ نر ہوں یہ مادہ صورت ہیں
خوب سے خوب تر؟ ارے توبہ
جونؔ اور جستجو کرے! توبہ
جو خود آجائے بس وہ لیلیٰ ہے
ہو، اگر اُس کا رنگ میلا ہے

نشے میں کاہلی کے مست ہوں میں
کہیے' ذوقِ نظر میں پست ہوں میں
ویسے بس بھی تو دیدہ زیب نہیں
جسم میرا بھی دلفریب نہیں
ہے مرا عکس ' زنگِ آئینہ
ہوں سراپا میں ننگِ آئینہ
پھر بھی اک مسئلہ تو رہتا ہے
نہ کہوں میں پہ دل تو کہتا ہے
جو بھی ہے اپنا دِل رُبا دِل بر
ایک بھی تو نہیں ہے خوش منظر
جمع خاطر ہو کس طرح صاحب
سب کے پستان تثنیہ غائب
لوحِ تن کا ہے ان کی کاف بھی قاف
ناف ' ترخا ہوا پیالۂ ناف
ہم کو پرچے لکھیں تو پرچوں میں
دوسرے شاعروں کے شعر لکھیں
کوئی تمیز ان کو ہے نہ شعور
پاسِ آداب سے ہیں کوسوں دور

ہم تو بس دل لگی کے کام کے ہیں
یعنی شاعر تو صرف نام کے ہیں
جن کے شعروں کی ہم سے داد اینٹھو
جا کے ان کی ہی گود میں بیٹھو
دل کی تعزیر ہے تمہارا شوق
ہم بھی اب اس قدر نہیں بدذوق

بحرِ ہزج

میں دوشادوشِ بیگانگی سے بے حسابانہ
زبوں تر ہو کے آیا ہوں
میں دوشادوشِ بیگانگی سے
سرِنگوں تر ہو کے آیا ہوں

....

غمِ شفاف سوزاں آسماں سے آسمانوں تک
کسی احساس سے اُس کی کنایہ زن نکوہش سے بھی
مایہ ور نہیں کرتا
کوئی بھی لمحہ ہو وہ دوسرے کو سر نہیں کرتا

....

پیاپے اب سے اب تک ایزداں ایزد ہے
اہرمین ہے اور ان میں سے اک مَیں ہوں
مگر ہم میں سے آخر اپنا ہونا اور ہو سکنا
گمانوں کے گماں میں کون سہہ پائے گا
آخر کون؟
یعنی کون سہہ پایا؟

....

سوال از خود، سوال از خود
ملال از خود، ملال از خود
عذابِ صد عذاب از خود
جواب از خود، جواب از خود

....

"مگر اُن کا کوئی آہنگ تو ہوگا
سخن آگیں خموشی کا کوئی نیرنگ تو ہوگا؟"
"فقط بحرِ ہزج! یعنی:
مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن"

وہ

وہ کتابِ حُسن ، وہ علم و ادب کی طالبہ
وہ مہذّب، وہ مودّب، وہ مقدس راہبہ
کس قدر پیرایہ پرور اور کتنی سادہ کار
کس قدر سنجیدہ و خاموش، کتنی باوقار
گیسوئے پُرخم، سوادِ دوش تک پہنچے ہوئے
اور کچھ بکھرے ہوئے، اُلجھے ہوئے، سمٹے ہوئے
رنگ میں اُس کے عذابِ خیرگی شامل نہیں
کیفِ احساسات کی افسردگی شامل نہیں
وہ مرے آتے ہی اُس کی نکتہ پرور خامشی
جیسے کوئی حُور بن جائے یکایک فلسفی

مجھ پہ کیا، خود اپنی فطرت پر بھی وہ کھلتی نہیں
ایسی پُراسرار لڑکی میں نے دیکھی ہی نہیں
دخترانِ شہر کی ہوتی ہے جب محفل کہیں
وہ، تعارف کے لیے آگے کبھی بڑھتی نہیں

ناکارہ

کون آیا ہے؟
کوئی نہیں آیا ہے، پاگل!
تیز ہوا کے جھونکے سے دروازہ کھلا ہے
اچھا! یوں ہے؟
بیکاری میں ذات کے زخموں کی سوزش کو اور بڑھانے
تیز روی کی راہگزر سے
محنت کوش اور کام کے دن کی
دھول آئی ہے، دھوپ آئی ہے!
جانے یہ کس دھیان میں تھا، میں
آتا تو، اچھا، کون آتا؟
کس کو آنا تھا، کون آتا؟

دیکھنے چلو

وہ کہکشاں، وہ راہ گزر، دیکھنے چلو
جونؔ ایک عمر ہوگئی، گھر دیکھنے چلو

رقصاں تھیں زندگی کی طرحداریاں جہاں
دنیائے شوق کا وہ کھنڈر دیکھنے چلو

تاریک ہوگئی ہے نظر عہدِ ہجر میں
خلدِ نظر کو ایک نظر دیکھنے چلو

شامِ کنارِ بان ہے اب بھی شفق نگار
رنگوں کا موج موج، سفر دیکھنے چلو

اِک ڈھیر خاک کا ابھی موجود ہے وہاں
وہ طاق، وہ رواق، وہ دَر، دیکھنے چلو

وہ خواب خواب شہر بلاتا ہے پھر تمہیں
پھر ایک بار خوابِ سحر دیکھنے چلو
سرکارِ فارہہ کی حریمِ تباہ کو
خونیں نواؤ' خاک بسر' دیکھنے چلو
جس کے تراشنے میں وہ شیریں بھی تھی شریک
وہ اپنا بے ستونِ ہنر' دیکھنے چلو
وہ رنگ کے مزار' وہ نکہت کی تربتیں
ہے دیکھنا عذاب' مگر' دیکھنے چلو
جون! اُس شکستہ آئینہ خانے کے رُوبرو
آئینہ لے کے دیدۂ تر' دیکھنے چلو!

جوانی

حقیقت خیز تہمت ہے جوانی
اِک آلودہ طہارت ہے جوانی
کبھی ہر لمحہ راحت ہے جوانی
کبھی ہر دم مصیبت ہے جوانی
سوادِ نقطۂ آلام ہو کر
محیطِ عیش و عشرت ہے جوانی
بقولِ بعض یارانِ جواں سال
گناہوں کی شریعت ہے جوانی
بصد ناپاکیٔ احساس و افکار
بیانِ حُسنِ نیت ہے جوانی

کبھی خود اپنے حق میں سمِّ قاتل
کبھی داروئے ملّت ہے جوانی
کبھی ہر اک نفس مصروف و مشغول
کبھی فرصت ہی فرصت ہے جوانی
نہ جانے کیوں، نہ جانے کس بنا پر
اِک احساسِ ندامت ہے جوانی

دو مشورے

ایک لیڈر نے دیا ہے لیڈروں کو مشورہ
خوب ہی سرکار کو بدنام کرنا چاہیے
ماہرانِ شان سے بتلا کے اعداد و شمار
محکموں پر یورشِ الزام کرنا چاہیے
اور پریشاں حال مِلّت کو خلوصِ دل کے ساتھ
مُبتلائے وحشتِ انجام کرنا چاہیے
اپنی ہر تقریر میں، ہر پارٹی کے واسطے
اہتمامِ طعنۂ و دشنام کرنا چاہیے
زیب تن کر کے سلیقہ سے لباسِ مغربی
قوم کی تہذیب کا اکرام کرنا چاہیے

ہو یہ ہر تقریر میں شامل الیکشن کے قریب
آپ سب لوگوں کو مِل کے کام کرنا چاہیے
اور چَل جائے سفارش بھی تو پرمٹ کے طفیل
تاجروں کو بڑھ کے زیرِ دام کرنا چاہیے
دے کے اخباروں میں چندہ پارٹی کے فنڈ سے
شوخ فطرت سُرخیوں کو رام کرنا چاہیے
بھائیو! اس گفتگوئے خاص کا مطلب یہ ہے
کام تو ہوتا رہے گا ' نام کرنا چاہیے
کم سے کم ہو جائے صوبائی وزیروں میں شمار
یہ دُعا ہر روز ' صبح و شام کرنا چاہیے
برخلاف اس کے ہے میرا مخلصانہ مشورہ
جس کو لوحِ ذہن پر ارقام کرنا چاہیے
رحم کھا کے لیڈروں کو اپنے حالِ زار پر
کم سے کم سو سال تک آرام کرنا چاہیے

بُت شکن

لے کے آیا ہوں تمہارے سامنے سینے کے داغ
دیر سے لو دے رہے تھے بادۂ فن کے چراغ
ایک رہرو جا رہا تھا راستے میں بے خیال
دل کو مستقبل کی اُمیدوں سے بہلاتا ہوا
تم اچانک آئیں اور خاص اک دوراہے کے قریب
اپنی پائل کے ترنم نے اُسے چونکا دیا
اور اُس سے اُسکی منزل کا تصور چھین کر
ایک بے مقصد سفر کے عہد و پیماں کر لیے
اب تمہاری رہبری تھی اور تخیل کا فریب
راستے بدلے گئے اور کارواں بڑھنے لگے

ذہن پر چھاتا گیا رنگین خوابوں کا فسوں
زندگی کرنے لگی خوابوں کے گلزاروں میں رقص
رات کی تنہائیوں میں شہرِ انجم کے سفر
کہکشاں تا کہکشاں نادیدہ سیاروں میں رقص
مجھ کو بخشے تھے انھیں نظروں نے میخانوں کے خواب
عارض و گیسو سے وابستہ شبستانوں کے خواب
ساحلِ آغوشِ سرمستی میں طوفانوں کے خواب
کیا مگر خوابوں کا حاصل، وہ بھی دیوانوں کے خواب
اور پھر وہ دور بھی آیا کہ تم اُکتا گئیں
اپنی حد سے بڑھ گئی تھیں، اپنی حد میں آگئیں
میں فریبِ آرزو کھاتا رہا ، جیتا رہا
زہرِ غم پیتا رہا ، پیتا رہا ، پیتا رہا
چاک کرتی ہی رہیں تم جیب و دامانِ وفا
اور میں سہتا رہا ، سہتا رہا ، سہتا رہا
جانے کیوں تم مستقل دامن کشاں رہنے لگیں
بے سبب نامہرباں ، نامہرباں رہنے لگیں
بھول کر عہدِ نظر جانے کہاں پہنچا خیال
چھوڑ کر شہرِ وفا جانے کہاں رہنے لگیں

آہ! وہ نازِ محبت کا یقین و اعتبار
میں نے تم کو دمبدم آواز پر آواز دی
پھر حدودِ حسرت و اُمید تک ڈھونڈا تمہیں
روح کی وادی میں دل کے ساز پر آواز دی
لوگ کہتے ہیں یقیناً ٹھیک ہی کہتے ہیں لوگ
میں فقط وہموں کی دنیا میں سفر کرتا رہا
میں نے چاہی بجلیوں سے خرمن اندوزی کی داد
پتھروں سے خواہشِ لطفِ نظر کرتا رہا
کیا تمہارے شہر میں لے کر دعاؤں کے حصار
نوجوانی کو مِٹانے کے لیے آیا تھا میں
کیا شعورِ زندگی کی داد پانے کے بجائے
میکدوں میں لڑکھڑانے کے لیے آیا تھا میں
اب شعورِ زندگی کو آزمانے دو مجھے
کچھ حجاباتِ مزاجِ دل اُٹھانے دو مجھے
ایک ہی رُخ تم نے دیکھا ہے ابھی تصویر کا
آج اُس کا دُوسرا رُخ بھی دِکھانے دو مجھے
تم کو اپنایا تھا، تم کو چھوڑ بھی سکتا ہوں میں
بُت بناتا ہی نہیں ہوں، توڑ بھی سکتا ہوں میں

مرگِ مسیحائی

پروفیسر ظہیر نقشی

ادب کو عموماً دو اقسام میں بانٹا جاتا ہے۔ ایک طربیہ دوسری المیہ۔ دنیا کی تقریباً تمام بڑی زبانوں کے ادب میں طربیہ کے مقابلے میں المیہ ادب مقدار اور معیار کے لحاظ سے کمتر اور پست تر ملتا ہے۔ قدیم عربی شعراء میں ایک مشہور شاعرہ خنساء کا نام ملتا ہے جس نے زندگی بھر اپنے بھائی کے غم میں اشعار کہے۔ حضرت عبدالمطلبؓ کے بارے میں ان کی وفات پر ان کی شرافت، شجاعت، سخاوت، خانہ کعبہ کی خدمت اور عرب قوم کی سربلندی وعظمت سے متعلق کارناموں کے بارے میں کچھ اشعار کہے گئے۔ حضرت عمرؓ نے ایک شاعر سے کہا کہ میرے بھائی کی وفات پر اشعار لکھ کر لاؤ۔ جب اس نے اشعار سنائے تو انہوں نے کہا: ''ان میں وہ زورِ بیان اور درد واثر نہیں جو تمہارے بھائی کے بارے میں کہے گئے اشعار میں ہے''۔ شاعر نے برجستہ کہا: ''جناب! وہ میرا بھائی تھا، اس کی موت سے میرے دل پر چوٹ لگی تھی، اگر آپ اپنے بھائی کے بارے میں لکھتے تو شاید اس میں درد واثر زیادہ ہوتا''۔ فارسی میں فردوسی نے شاہنامے میں سہراب کی موت پر اس کی ماں تہمینہ کی زبانی رنج وغم کا اظہار کیا ہے۔ فرخی نے محمود غزنوی کی وفات پر دس بارہ اشعار لکھے۔ انگریزی زبان میں شاعر گرے کی ایک المیہ نظم ملتی ہے۔ ان تمام المیہ نظموں میں کلام کا وہ زور اور درد واثر کی وہ شدت نہیں جو ان زبانوں کی دوسری اصناف میں ملتی ہے۔ ان تمام مثالوں سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ لوگ عموماً صرف خاص تعلق کی بنا پر ہی ایک دو بار کسی کے غم میں مل کر روتے ہیں پھر یاد بھی محو ہو جاتی ہے، لیکن خوشی اور تفریح کے مواقع پر سب مل کر ہنستے اور بار بار خوشی مناتے ہیں۔

اُردو زبان کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس کا المیہ ادب بھی طربیہ ادب کی طرح تنوع اور تاثر کے لحاظ سے بہت وقیع اور وسیع ہے بلکہ مقدار اور معیار دونوں لحاظ سے بھی نہایت ارفع واعلیٰ ہے۔ اُردو کے المیہ ادب کو بھی دو زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اوّل مرثیہ، دوم رثائی نظمیں۔ مرثیہ خصوصاً شہدائے کربلا اور سانحۂ کربلا سے تعلق رکھتا ہے، اس کی ہیئت بھی مسدس کی شکل میں مقرر ہو گئی ہے۔ رثائی نظموں کے سلسلے میں موضوعات اور ہیئت کی کوئی قید نہیں ہے۔ یعنی رثائی نظموں میں مرثیے کے سوا دوسری رثائی اصناف مثلاً سلام و نوحہ اور عام اصناف جیسے غزل، مثنوی، رباعی، نظم وغیرہ کسی بھی صنف میں لکھے ہوئے اشعار شامل ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ہر طرح کی شخصیات اور واقعات سے متعلق بھی بے شمار رثائی نظمیں لکھی جاتی ہیں جو بیشتر کچھ عرصے تک نگاہوں اور زبانوں پر رہنے کے بعد کتابوں اور رسالوں میں مدفون ہو جاتی ہیں۔ البتہ تین چار رثائی نظمیں اُردو میں ایسی ہیں جو زندۂ جاوید ہو گئی ہیں جن میں سے دو مرزا غالبؔ کے دیوان کی زینت ہیں، تیسری حالیؔ کی مرزا غالبؔ کی وفات پر رثائی نظم اور چوتھی علامہ اقبال کی داغؔ کی وفات پر رثائی نظم۔ عموماً ان نظموں کو بھی مرثیہ کہا جاتا ہے لیکن بہتر یہی تھا کہ مرثیہ نہ کہا جاتا مگر رواجِ عام کے خلاف چارہ نہیں۔

مرزا غالبؔ غیر معمولی قدرتِ کلام رکھنے کے باوجود مرثیہ نہیں لکھ سکے۔ فرمائش پر صرف تین بند لکھ کر قلم رکھ دیا اور معذرت کر لی۔ مگر اپنی بیوی کے بھانجے عارف کے غم میں جو غزل نما رثائی نظم لکھی اس کے ہر شعر میں رنج و الم کی فراوانی ہے۔ دوسری رثائی نظم جو واقعی غزل ہے کیونکہ اس میں ممدوحہ یا موصوفہ کا نام یا کوئی حوالہ بھی نہیں ہے۔ اس کی ردیف ہائے ہائے اور قافیے اشکباری، پردہ داری وغیرہ ہیں۔ یہ صرف غزل نہیں اپنی ندرت، شدت اور رقت کے لحاظ سے بجائے خود ایک مرثیہ ہے۔ قرینِ قیاس یہی ہے کہ وہ خود مرزا غالبؔ کی حرماں نصیب محبوبہ کے بارے میں ہے اور جس مرحومہ کا ذکر ان کی سسرال کے خوف سے صرف ''ڈومنی'' کی عرفیت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ تیسری رسائی نظم خود مرزا غالبؔ کے بارے میں ہے جو ان کے عزیز شاگرد اور اُردو کے عظیم ادیب و شاعر مولانا حالیؔ نے لکھی تھی۔ چوتھی نظم داغؔ دہلوی کے بارے میں ہے جو ان کے عزیز شاگرد علامہ اقبال نے لکھی تھی۔ ان چاروں رثائی نظموں میں

ہیئت' طوالت اور شاعرانہ محاسن کے لحاظ سے مولانا حالی کی رثائی نظم کو جو "مرثیۂ غالب" کے نام سے مشہور ہے' سب پر فوقیت حاصل ہے۔ اگرچہ اُردو شعراء میں عام طور پر مولانا حالی کو روکھی پھیکی سادگی' تنقید اور معمولی یا اوسط درجے کے مضامین کی وجہ سے درجۂ اوّل کا شاعر تسلیم نہیں کیا جاتا مگر ان کی گدڑی میں "مسدسِ حالی" اور "مرثیۂ غالب" جیسے لعل و زمرد بھی ہیں۔ علامہ اقبال کا "مرثیۂ داغ" بھی اگرچہ نہایت اعلیٰ اور دلگداز ہے مگر ان کی دیگر شاہکار نظموں کے معیار تک وہ نہیں پہنچتا۔

جون ایلیا نے بھی غالباً ۱۹۵۶ء میں جبکہ ان کی عمر ۲۵ یا ۲۶ سال تھی ایک مکمل رثائی نظم جو ترکیب بند کی صورت میں ہے اور جس کے کل اشعار ۶۹ ہیں اپنے چچا حکیم سید میر احمد نقوی کی ناگہانی موت سے شدید متاثر ہو کر لکھی تھی۔ اس وقت وہ غالباً علوم والسنۂ شرقیہ کے درجاتِ عالم و فاضل سے فراغت پا چکے تھے۔ یہ غیر مطبوعہ شہپارۂ گراں قدر نظم جون کے لڑکپن کا کلام ہے اور جس کا عنوان "مرگِ ناگہاں" ہے گم ہو گئی تھی۔ یہ نظم ہیئت' مضامین' محاسنِ کلام اور طوالت کے لحاظ سے واقعی مولانا حالی کے "مرثیۂ غالب" کا جواب ہے۔ جون ایلیا کے منتشر مسودات کے ذخیرے سے اس متاعِ گمشدہ اور شہپارۂ فراموش کردہ کی دستیابی بلکہ بازیافت نے تحقیق' تجزیے اور تنقید کا ایک نیا باب کھول دیا ہے۔ اس نظم میں سے صرف ۲۴ عدد اشعار کے انتخاب' دو عدد اشعار کے اضافے اور چند مصرعوں میں ترمیم الفاظ کے بعد ۱۹۹۸ء میں جون ایلیا نے حکیم سعید شہید کی ناگہانی شہادت پر غالباً عجلت میں خراجِ عقیدت اور اظہارِ رنج و غم کے لیے اس رثائی فن پارے کو "ماتمِ مسیحائی" کے نام سے پیش کر دیا تھا۔

یہ شائع شدہ رثائی نظم جو "ماتمِ مسیحائی" کے عنوان سے چھپی بجائے خود ایک مکمل اور بھرپور رثائی نظم ہے اور درحقیقت یہ "مرگِ ناگہاں" کا عطر بلکہ عطرِ مجموعہ ہے اور جون ایلیا کی شاعرانہ عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ چونکہ یہ مختصر ہے' اس لیے اسے اس شکل میں مولانا حالی کے "مرثیۂ غالب" کی بجائے علامہ اقبال کے "مرثیۂ داغ" کے مقابل رکھا جا سکتا ہے' کیونکہ یہ اسی قبیل کی چیز ہے۔ جون ایلیا نے اس نظم کو ذیلی نوٹ کے ساتھ بجا طور پر "چند قطرہ ہائے اشکِ خونیں حکیم محمد سعید کی یاد میں" سے تعبیر کیا ہے۔

عین ممکن تھا کہ جونؔ ایلیا کی اس مایۂ ناز رثائی نظم کا اقتباس ہی موجودہ مجموعے ''گویا'' میں ''ماتمِ مسیحائی'' کے عنوان سے شائع ہو جاتا اور اصل پوری نظم ''مرگِ ناگہاں'' ضائع ہو جاتی یا کوئی ادبی محقق مستقبلِ بعید میں اُسے دریافت کرتا۔ مگر حُسنِ اتفاق سے مجھے ''ماتمِ مسیحائی'' دیکھ کر ''مرگِ ناگہاں'' یاد آ گئی تو میری نشاں دہی پر جونؔ ایلیا کے قابلِ رشک وحیرت پرستار اور ان کے کلام کے قابلِ تحسین و آفرین امانت دار میاں خالد انصاری سلمۂ چونک پڑے اور انھوں نے نہیں معلوم کہاں کہاں اور کس کس طرح جستجو کر کے جونؔ ایلیا کا یہ گنجِ شایگاں اور اُردو ادب کا گوہرِ درخشاں وقت کی زنبیلِ سرمدی سے برآمد کر ہی لیا۔

اب یہ اُردو ادب کے اہلِ ذوق اور شاعری کے صاحبانِ نظر کا کام ہے کہ وہ مولانا حالیؔ کے ''مرثیۂ غالب'' اور جونؔ ایلیا کی اصل اور مکمل رثائی نظم ''مرگِ ناگہاں'' کا شاعرانہ نظر سے مطالعہ اور ناقدانہ نظر سے جائزہ لیں۔ اس سلسلے میں جونؔ ایلیا اور مولانا حالیؔ کی عمروں، تعلیمی استعداد وسعتِ مطالعہ، مشقِ سخن، ممدوحین یعنی غالبؔ، حکیم میر احمد امروہوی اور حکیم محمد سعید دہلوی کے علمی و فنی مرتبے، شاعروں سے رشتے، وغیرہ کا لحاظ بھی رکھنا ہوگا۔ جونؔ ایلیا کے ممدوحین یعنی حکیم صاحبان سے متعلق دو باتوں کے بارے میں سرِ دست اتنی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ (۱) حکیم میر احمد عرف اچھو صاحب طبِ یونانی سے متعلق علم اور تجربے میں حکیم محمد سعید صاحب سے کسی بھی طرح کم نہیں تھے۔ (۲) اسی طرح حکیم محمد سعید صاحب کے زیرِ علاج رہنے اور اپنے برادرانِ بزرگ جناب رئیس امروہوی اور سید محمد تقی صاحبان کے حکیم سعید صاحب سے دیرینہ تعلقات کی وجہ سے جونؔ ایلیا کے دل میں ان سے گہری محبت اور عقیدت حکیم میر احمد صاحب کی بہ نسبت کسی طرح کم نہیں تھی۔

چنانچہ جونؔ ایلیا نے اگر حکیم میر احمد صاحب کو جو سادات امروہہ کے مشہور و معزز خاندان، خانوادۂ شاہ ولایت، شرفاء و نجبائے امروہہ کے نمائندہ اور علاقے کے نامی گرامی حکیمِ حاذق تھے ''حضرت عمِ محترم تسلیم'' کہہ کر مخاطب کیا ہے تو حکیم محمد سعید صاحب کو جو دہلی کے نامی گرامی خاندانِ طب کے نمائندہ حکیمِ حاذق، ہمدرد دواخانہ پاکستان کے بانی و مالک اور پاکستان میں طبِ یونانی کے سب سے بڑے مؤسس، مربی اور محافظ تھے۔ ''حضرت اخی محترم

تسلیم'' کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ اس طرح یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جونؔ ایلیا کی یہ رثائی نظم دونوں شکلوں میں اور دونوں محترم ہستیوں کی ناگہانی رحلت اور قومی نقصان کے دلی رنج وغم کا بیساختہ اور برجستہ اظہار ہے۔

آخر میں جونؔ ایلیا کی اس رثائی نظم (مرگِ ناگہاں / ماتمِ مسیحائی) سے متعلق بحث کو ان الفاظ پر ختم کرتا ہوں کہ اس رثائی نظم کو جونؔ ایلیا کے دماغ کارسی اور روایتی تخلیقی فن پارہ سمجھنے کی بجائے ان کے دل سے اُبلتی ہوئی جوئے خون اور آنکھوں سے برسنے والا ابرِ خونبار سمجھنا چاہیے۔ اس رثائی نظم میں فصاحت و بلاغت' صنائع و بدائع' علومِ بیان و بدیع کی نزاکتیں نیز لفظی و معنوی رعایات' ممالک یونان و عرب و ایران و پاک و ہند کی سرزمینوں سے متعلق تلمیحات و تالیفات اور علومِ طب و فلسفہ و منطق و نفسیات و تصوف سے متعلق اشارات و کنایات' جونؔ ایلیا جیسے نابغۂ روزگار شاعر اور ماہرِ لسانیات و علوم فنکار کے قلم ہی سے نکل سکتے تھے۔

مرگِ ناگہاں

(ماتمِ مسیحائی)[1]

کس کا لُوٹا ہے کارواں تُو نے | کیا کیا مرگِ ناگہاں تُو نے
وقت کے دلپسند نغموں کو | کردیا نالہ و فغاں تُو نے
* چھین کر ایک جانِ شیریں کو | تلخ کردی ہے داستاں تُو نے
ناز پروردگانِ دولت کو | کردیا آج بے اماں تُو نے
تُف ہے! اے آسماں ترے اُوپر | توڑ ڈالا ہے سازِ جاں تُو نے
کیا بتاؤں میں کتنی آنکھوں کو | کردیا آج خوں فشاں تُو نے
* آفتابِ جہانِ حکمت کو | اے فلک! کھو دیا کہاں تُو نے

یہ خبر، اُف یہ حشر خیز صدا!
اس خبر کا یقیں نہیں آتا

---

[1] جن اشعار کے ساتھ * کا نشان ہے وہ اشعار "ماتمِ مسیحائی" کے عنوان سے حکیم محمد سعید کی شہادت پر روزنامہ جنگ میں ۲۱ویں اکتوبر ۱۹۹۸ء کو شائع ہوئے تھے۔

*قصرِ انفاس اتنا بے بنیاد — خانۂ مرگ و زندگی برباد
*کیا تخیل ہے یہ نظامِ جہاں؟ — کیا تمسخر ہے عالمِ ایجاد؟
کیسے شاداب پھول کمھلائے — کیسا آباد گھر ہوا برباد
کیسے لوگ اور اُن پہ یہ آفت — کیسے دل اور اُن پہ یہ اُفتاد
جو تھے امداد کرنے والوں میں — آہ! اب وہ ہیں قابلِ امداد
سوگواروں کی زیست کا مقصد — یاد، بس یاد اور کیسی یاد
*دلِ برباد، عمر بھر آہیں — لبِ فریاد، عمر بھر فریاد

*آج ہر دل کی آس ٹوٹ گئی
خود مسیحا کی نبض چھوٹ گئی

اعتبارِ حیات کچھ بھی نہیں — کچھ نہیں، کائنات کچھ بھی نہیں
سحر و شام، عشرت و آلام — صرف باتیں ہیں، بات کچھ بھی نہیں
ایک شعلہ ہے دن، بس اک شعلہ — اک دھواں ہے یہ رات، کچھ بھی نہیں
سارے اوراق منتشر کر دو — دفترِ واقعات، کچھ بھی نہیں
وہم ہے ربطِ جسم و جاں، اک وہم — نظمِ ذات و صفات، کچھ بھی نہیں
ایک سازش ہے طالعِ قسمت — حاصلِ التفات، کچھ بھی نہیں
ایک آراستہ جنازہ ہے — زندگی کی برات، کچھ بھی نہیں

چارہ گر ختم ہوں، جئیں بیمار
کچھ نہیں صحت و مرض پہ مدار

*چارہ گر بھی جو یوں گزر جائیں — پھر یہ بیمار کس کے گھر جائیں
*آج کا غم بڑی قیامت ہے — آج سب نقشِ غم اُبھر جائیں
ہے بہاروں کی روح، سوگ نشیں — سارے اوراقِ گل، بکھر جائیں
ناز پروردہ، بے نوا، مجبور — جانے والے یہ سب کِدھر جائیں
کل کا دن ہائے کل کا دن اے جون! — کاش! اِس رات ہم بھی مر جائیں
*ہے شبِ ماتمِ مسیحائی!! — اشک دامن میں تا سحر جائیں
*مرنے والے! ترے جنازے میں — کیا فقط ہم بچشمِ تر جائیں
*کاش! دل خون ہو کے بہہ جائے — کاش! آنکھیں لہو میں بھر جائیں

*تُو نہیں اے! طبیبِ لاثانی
مر گئے بو علیؑ گیلانی

*خود مسیحا اجل سے ہار گیا — زندگی تیرا اعتبار گیا!!
موت بھی ہاتھ مل رہی ہوگی — ایسی کچھ زندگی گزار گیا!
*آج اسبابِ فن ہوئے برباد — آج "قانون" کا وقار گیا
*دردمندانِ غم کہاں جائیں — جب مسیحائے روزگار گیا
آہ! دارالشفاء کی ویرانی — آج اِس گھر کا برگ و بار گیا
کیا گزرتی ہے آج اس گھر میں — جو بھی آیا، وہ اشکبار گیا
ہو گیا عہدِ پُر بہار تمام — آہ! وہ دورِ سازگار گیا

ہو گئی بارگاہِ طب ویران
آخری بار لُٹ گیا یونان

کچھ کہو تو ' یہ کیا ہوا آخر — کیسے نقشہ بدل گیا آخر
میں نے اُن کو ابھی تو دیکھا تھا — اور ابھی وقت ہو گیا آخر
کچھ کہو تو یہ واقعہ کیا ہے — کچھ بتاؤ تو ماجرا آخر
وہ تو دالان میں کھڑے تھے ابھی — کِس طرح آئی یہ بَلا آخر
چند لمحوں میں ایک گھر کا نظام — ایسے کیونکر بگڑ گیا آخر
کچھ وصیت بھی کر سکے کہ نہیں — آخری وقت کچھ کہا آخر
وہ سفر کی تکان میں ہو نگے — غور سے دیکھ بھی لیا آخر
اے زمیں! میرا قلب بن کے دھڑک — اے فلک! تجھ کو کیا مِلا آخر

آخری بار اُن کو دیکھ چلا
یہ تو میں سوچ بھی نہ سکتا تھا

*جونؔ حاضر ہے از پئے تعظیم — حضرتِ عمِّ محترم ' تسلیم!
آپ تو سو رہے ہیں حُجرے میں — گھر میں برپا ہے ایک شورِ عظیم
آپ کو کاش یہ خبر ہوتی — ہم پہ نازل ہے کیا عذابِ الیم
ہم نے حصّے میں صرف غم پایا — آج یوں قسمتیں ہوئیں تقسیم
خلشِ خارِ غم سے بِسمل ہیں — آپ کے یاسمن مزاج یتیم
آپ کے بعد ان غریبوں کو — کون سمجھے گا لائقِ تکریم
*چند لمحوں میں ہوگئی ویران — حکمت و فن کی بارگاہِ قدیم

*کیا کہیں' کچھ نہیں ہے کہنے کو
ہائے! کیا غم مِلا ہے سہنے کو

*عمر بھر یہ سحر نہ آئے گی
یہ سحر عمر بھر نہ آئے گی

غمِ دل اب نہ پائے گا تسکین
حالت اصلاح پر نہ آئے گی

چشمِ گریاں! خبر ہے کچھ دل کی
اب بھی تُو خوں سے بھر نہ آئے گی

جو ہوا کارواں کے ساتھ گئی
وہ ہوا لوٹ کر نہ آئے گی

سو گئے لے کے آخری ہچکی
اب صدائے دگر نہ آئے گی

سُونگھ لو ان کا تار تار کفن
اب یہ خوشبو اِدھر نہ آئے گی

دیکھنے والے دیکھ لیں صورت
پھر یہ صورت نظر نہ آئے گی

نکہتِ گلشنِ وقار گئی
کتنی یادوں کی یادگار گئی

*لوگ آئے ہیں اُن کو چونکا دو
اور ذرا کاغذ و قلم لا دو

*اُن کو لکھنے ہیں نسخہ ہائے شفا
قبر میں روشنی تو پہنچا دو

وہ بہت جلد آنے والے ہیں
سب مریضوں کو جا کے سمجھا دو

اُن کا دل نرم ہے، بہت ہی نرم
بین کر کے نہ اُن کو ایذا دو

لو برآمد ہوئی وہ مسندِ خاص
حُکما! جاؤ بڑھ کے کاندھا دو

صُلحا! ایک صف میں آجائیں
فُضلا! تم ذرا اُتروا دو

*اہلِ خانہ! متاعِ شہر تھے وہ
شہر والوں کو جا کے پُرسا دو

*اُن کی عظمت کا کچھ حساب نہ تھا
شہر کیا، دُور تک جواب نہ تھا

بول ، اے ناصحِ شکیبائی! کیا ضروری تھا، موت کیوں آئی؟
دخل کس کو بھلا مشیت میں کیا مشیت ہے، صرف خود رائی؟
کیا میں پوچھوں کہ اُن کے مرنے سے کیا مِلا ، کس نے زندگی پائی؟
سب کو مٹنا ہے، سب کو مرنا ہے؟ ڈوب جائے یہ شوقِ یکتائی!
جبرئیل و خدا کی عمر دراز اشرف الخلق کی یہ رسوائی!

خواہشِ زیست کس سے چھوٹی ہے
اُمتِ صادقین جھوٹی ہے

قومی نظمیں

پرتوِ تنویرِ سحر

(۲۳ویں مارچ ۱۹۵۷ء یومِ جمہوریہ پر)

ناطقہ آج کہیں سرِبگریباں تو ہوا
نئے حالات کی توجیہہ کا ساماں تو ہوا
لفظِ جمہور بہ پیرایۂ یک نقشِ جمیل
لوحِ دیوانِ تمدن پہ فروزاں تو ہوا
سایۂ پیکرِ رقاصۂ تدبیر و نظر!
بزمِ تہذیب کی دیوار پہ رقصاں تو ہوا
تیرہ و تار نگاہوں میں سُلگتا ہوا خواب
آج تعبیر کے مطلع پہ نمایاں تو ہوا
سینکڑوں سال کی مکروہ سیاست کا چلن
اپنے پیراہنِ شفاف میں عریاں تو ہوا
گو فضاؤں میں ابھی کچھ دام بچھے ہیں لیکن
طائرِ شوق فضاؤں میں پرافشاں تو ہوا
یہ بجا ہے کہ ابھی دُور ہے منزل لیکن
قافلہ' جادۂ منزل میں خراماں تو ہوا

سخت ناپید تھے اسبابِ پریشانیٔ دل
دل کسی "خاص تصور" سے پریشاں تو ہوا
اپنی تاریخ کے اوراق میں بارِ اوّل
نئے ابواب کی تدوین کا ساماں تو ہوا
تیرے اعزاز میں اے شامِ نشاطِ فردا!
آج محرابِ تصور پہ چراغاں تو ہوا
اُٹھتے اُٹھتے یہ حجابات بھی اُٹھ جائیں گے
کوئی در پردۂ دل، سلسلہ جنباں تو ہوا
گو فسردہ ہی سہی روحِ گلستاں پھر بھی
ایک ہنگامہ، بہ عنوانِ بہاراں تو ہوا
گو ابھی تفرقۂ دیر و حرم باقی ہے
پھر بھی اس ضمن میں اک کارِ نمایاں تو ہوا
اب بھی موجود ہے سرمایہ و محنت کا تضاد
ہاں مگر شیوۂ تاویلِ پریشاں تو ہوا
یہ سحر ایک خبر ہے تو خبر کیا کم ہے
دوستو! پرتوِ تنویرِ سحَر کیا کم ہے

اے وطن!

رنگ و فرہنگ و آہنگ کی انجمن
اے وطن! اے وطن! اے وطن!
ارتقائے تمدن کا عنواں ہے تُو
یعنی منجملۂ مصر و یوناں ہے تُو
رہبرِ عہدِ نو تیرا عہدِ کہن
اے وطن، اے وطن، اے وطن
تُو نے پھیلائی عرفان کی روشنی
علم و حکمت کے ایوان کی روشنی
تیری تاریخ ہے مظہرِ فکر و فن
اے وطن! اے وطن! اے وطن!

سر بہ سر جلوہ گاہِ بہاراں ہے تُو
ذرّہ ذرّہ ترا جنتِ آرزو
نازشِ گلستاں تیرے دشت و دمن
اے وطن! اے وطن! اے وطن! اے وطن!

تجھ کو عنوانِ ہستی بنائیں گے ہم
زندگی بھر ترے گیت گائیں گے ہم
رونقِ بزمِ جاں ہے ترا بانکپن
اے وطن! اے وطن! اے وطن! اے وطن!

نگارِ فن

(۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد پہلا تاثر)

بہت لکھا ہے تری زُلفِ پُرشکن کے لیے
نگارِ فن! مرے نغمے ہیں اب وطن کے لیے
مرے رَجز کی ضرورت ہے رزم گاہوں کو
وداع کر مری بانہوں، مری نگاہوں کو
وفا کا معرکۂ لالہ کار آپہنچا
حریف، پیشِ دیارِ بہار آپہنچا
حریمِ فن کو بچانے کا وقت ہے، یہ وقت
خود اپنے خوں میں نہانے کا وقت ہے، یہ وقت
پئے ستیز، جوانانِ سینہ خیز چلے
شباب، داد طلب تھا، سو تیز تیز چلے

نہیں ہیں تیرے وفادار غیر کے ساتھی
ہیں خیر و شر کی لڑائی میں خیر کے ساتھی

یہ معرکہ تو ہے خود اس حرم سرا کے لیے
ترے لیے، تری انگڑائی کی فضا کے لیے

نگارِ فن! یہ در و بام ارجمند رہیں
تری گلی کے طرح دار سربلند رہیں

وداع کر مری بانہوں، مری نگاہوں کو
رکھے بہار سمن پوش، تیری راہوں کو

فروغِ جوہرِ پنہاں

وطن کو شان و شکوہِ جواں مبارک ہو
ہوئی ہے روحِ وفا کامراں مبارک ہو
فروغِ جوہرِ پنہاں ظہور میں آیا
نشاطِ ہاہلۂ امتحاں مبارک ہو
ہوئی جہانِ کہن سے جہانِ نو کی نمود
نئے ستون، نیا سازماں مبارک ہو
ہوئی ہے قوم سے اک قوم زندہ تر پیدا
عمل کی رُوحِ رَمان و دواں مبارک ہو
زندہ تر ہیں نگاہیں، جہندہ تر ہے لُہو
یہ سوزِ دل، یہ تب وتابِ جاں مبارک ہو

زمیں! زیب ہیں تیرا ترے زَبَر مرداں
فضا کو فرِ فضا داوراں مبارک ہو
غزاوٗ غلغلۂ غَرش و غریو غرش
جلالِ غیظِ غریوندگاں مبارک ہو
شناورانِ سرِ موج خیز قلزمِ خوں!
شعارِ فخرِ گراں مایگاں مبارک ہو
تگاوران و تکانندگان دشتِ نبرد
نہیبِ بکتر و بَرگستواں مبارک ہو
ہجوم و ہمہمۂ حرب و حملۂ و ہیجا
شکوہِ عشرتِ شیرِ ژیاں مبارک ہو
نیازِ دیدۂ و دل' اے سرانِ سرانداز!
مبارک' اے صفِ صف بشکناں! مبارک ہو
جو اپنے خون سے لِکھ کر گئے ہیں سطرِ حیات
اُنہیں بقا کا نگین و نشاں مبارک ہو
وصالِ ذات کے زانو پہ جو ہوا آخر
ہے وہ نفَس، نفَسِ جاوداں مبارک ہو
ہو آسمانِ وطن کو نئی زمیں کی نوید
زمیں! تجھ کو نیا آسماں مبارک ہو

سخنوروں کا سلام

وفا کے نعرہ زنوں کو سلام کرتے ہیں
ہم اپنے صف شکنوں کو سلام کرتے ہیں

جو دشمنوں کو دبائے ہوئے ہیں، اُن کو سلام
جو اپنے خوں میں نہائے ہوئے ہیں، اُن کو سلام
جو کم ہیں پھر بھی جو چھائے ہوئے ہیں، اُن کو سلام

ہم اپنے صف شکنوں کو سلام کرتے ہیں

دلاورانِ گرامی! صد آفریں تم پر
کہ رزم گاہ میں غالب، کوئی نہیں تم پر
ہمیشہ ناز کرے گی، یہ سر زمیں تم پر

ہم اپنے صف شکنوں کو سلام کرتے ہیں

ہلالِ فتح کا پرچم ، بُلند ہے تم سے
عظیم قوم کی عظمت ، دو چند ہے تم سے
وطن کا نام و نشاں ، ارجمند ہے تم سے

ہم اپنے صف شکنوں کو سلام کرتے ہیں

وقارِ قوم ہو تم ، اعتبارِ قوم ہو تم
جلالِ قوم ہو ، آئینہ دارِ قوم ہو تم
ہے قوم تم پہ فِدا ، جاں نثارِ قوم ہو تم

ہم اپنے صف شکنوں کو سلام کرتے ہیں

تمام رہ گزروں کی ، دعا قبول کرو
دریچوں اور دروں کی ، دعا قبول کرو
وطن کے سارے گھروں کی ، دُعا قبول کرو

ہم اپنے صف شکنوں کو سلام کرتے ہیں

مجاہدوں کو وطن کے سخن وروں کا سلام
دل و نگاہ کی دنیا کے رہبروں کا سلام
تمام خوش نظروں، نکتہ پروروں کا سلام

ہم اپنے صف شکنوں کو سلام کرتے ہیں

شہید جیت گئے

شہید جیت گئے ' شہسوار جیت گئے
دیارِ پاک! ترے جاں نثار جیت گئے
وفائیں تیرے لیے اے مرادِ جاں بازاں!
ترے جمال کے آئینہ دار جیت گئے
خزاں کی بادِ مخالف نے جن کو چھیڑا تھا
وہ تیرے سبز نشاں ' اے بہار جیت گئے!
فضا نورد ' ترے چھا گئے فضاؤں پر
ترے جوان ' سرِ کارزار جیت گئے
حریمِ عظمتِ اقبالؔ تجھ کو مژدہ ہو
کہ تیرے لوگ ' ترے نامدار جیت گئے

وفا ہے معجزۂ جسم و جاں سو کام آئی
ہجوم ہار گیا، کم شمار جیت گئے

بنا ہے خونِ جگر مژدۂ فروغِ سحر
تپیدگانِ شبِ انتظار جیت گئے

دلوں کو تیرا سہارا بڑا سہارا تھا
غرور ہار گیا، خاکسار جیت گئے

فضا فضا ہے یہ نغمہ، نوا نوا یہ صدا
فدائیانِ سرِ کوئے یار جیت گئے

مزارِ قائدِ اعظم تجھے مبارک ہو
ہمارے شہر، ہمارے دیار جیت گئے

ہوں تیری آن کے قربان، عاشقوں کے ہجوم
ترے نثار، تیرے جاں نثار جیت گئے

سلامِ فتح

(۱۹۷۱ء کی جنگ میں کراچی کے شہداء کو خراجِ عقیدت)

سلامِ فتح! کراچی ترے جیالوں پر
رہیں گے یاد جو تیور دکھائے ہیں تم نے
جلال و جوش کے منظر دکھائے ہیں تم نے
عجب کمال کے جوہر دکھائے ہیں تم نے
سلامِ فتح! کراچی ترے جیالوں پر
وفا کی تم وہ ادا ہو جو دل‌نواز ہوئی
تمہاری حوصلہ‌مندی متاعِ ناز ہوئی
تمہاری شان فضاؤں میں سرفراز ہوئی
سلامِ فتح! کراچی ترے جیالوں پر

یہ ارضِ پاک تمہیں زندگی سے پیاری ہے
اسی کے واسطے ہر چیز تم نے واری ہے
تمہارے عشق کی فطرت ہی جاں نثاری ہے
سلامِ فتح! کراچی ترے جیالوں پر
وفائیں نغمہ فشاں ہیں تمہاری گلیوں میں
جو ولولے ہیں، جواں ہیں تمہاری گلیوں میں
قدم قدم، دل و جاں ہیں تمہاری گلیوں میں
سلامِ فتح! کراچی ترے جیالوں پر

اِستفسار

(۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء، سقوطِ مشرقی پاکستان پر)

کیا اِس قدر حقیر تھا اس قوم کا وقار
ہر شہر تم سے پُوچھ رہا ہے، جواب دو!
یہ بات کیا ہوئی کہ بیابانِ وقت میں
احساسِ تشنگی کو بڑھا کر سراب دو
ہم کو تھپک تھپک کے دِکھائے گئے تھے خواب
خاموش کیوں ہو؟ اب ہمیں تعبیرِ خواب دو
جو صَرفِ گلستاں نہ ہوا، رائیگاں گیا
اس خونِ شاہدانِ وفا کا حساب دو

○

مِلّت کے احترام کو رُسوا کیا گیا
پُرحوصلہ عوام کو رُسوا کیا گیا
لینا تھا اِس زمیں پہ شفق سے جسے خراج
اِس رنگِ صبح و شام کو رُسوا کیا گیا
تھیں اپنے حوصلوں کی صفیں جس سے آہنیں
اُس نظم، اُس نظام کو رُسوا کیا گیا
نازاں تھا جس پہ منزلِ عظمت کا اعتبار
اُس شوکتِ خرام کو رُسوا کیا گیا
تاریخ جس کے سامنے رہتی تھی سجدہ ریز
اُس عظمتِ دوام کو رُسوا کیا گیا
اے غازیو! جہاد کی توہین کی گئی
اے شاعرو! کلام کو رُسوا کیا گیا
جو لکھ رہے تھے خون سے تاریخِ فصلِ رنگ
ان نامیوں کے نام کو رُسوا کیا گیا

○

یہ پُوچھتی ہیں وقت سے خوددار بستیاں
جس نے ہمیں فریب دیا ہے، وہ کون ہے؟

کس نے کیا ہے قوم کے زخموں کو بے وقار
جس نے ہمیں ذلیل کیا ہے‘ وہ کون ہے؟

○

کس نے کہا کہ ہار گئے اپنے حوصلے
ہم اپنے حوصلوں کے رَجز خواں ہیں آج بھی
ہم کو شکستِ ولولۂ جاں نہیں قبول
ہم پاسدارِ ولولۂ جاں ہیں آج بھی
ہم جو لہولہان ہوئے حق کے واسطے
ہم لوحِ روزگار کا عنواں ہیں آج بھی
کھائے ہیں ہم نے زخم‘ اُٹھائے ہیں ہم نے داغ
ہم نامدارِ رنگِ بہاراں ہیں آج بھی

○

ناقابلِ شکست ہیں اِس قوم کے عوام
اِس قوم کے عوام کی تعظیم کیجیے
یہ قوم آج بھی ہے سرافراز و سُرخرو
اس قوم کے جلال کو تسلیم کیجیے

○

مانا نہیں ہے‘ ہم نے غلط بندوبست کو
ہم نے شکست دی ہے‘ ہمیشہ شکست کو

مرہم جواب

ہیں بزمِ شب میں پر افشاں گماں گماں لمحے
گزر رہا ہے جو سال اُس کے رائگاں لمحے
متاعِ نیم شبی ہیں، دھوئیں کے مرغولے
بکھر رہے ہیں اُلجھ کر زیاں زیاں لمحے
نہ زرد زرد ہوں کیوں وقت کے لب و رخسار
کہ سال سال گزارے، خزاں خزاں لمحے
عجیب دور گزارا ہے شب نشینوں نے
ہر ایک سال کے لمحے تھے بے اماں لمحے
شمار گاہِ نفس میں شمارِ زخم بنے
ہمارے دل کی شکستوں کے نیم جاں لمحے

بھیگ گئے ہیں ہمارا نفس نفس خوں میں
حیاتِ خوں شدہ! تیرے وہ خونچکاں لمحے
یہ صرف عمرِ گزشتہ کی گرد ہے یا ہم
فضا میں پھیلے ہوئے ہیں دُھواں دُھواں لمحے

○

سیاہ سال پہ بحرانِ مرگ طاری ہے
نفس نفس پہ تغیر کا حکم جاری ہے
یہ اُس تباہ شدہ سال کی ہے آخری شب
کہ جس میں صرف ہلاکت ہے، سوگواری ہے
تمام ہو گئی لو، انتظار کی ساعت
قریب منزلِ صبحِ اُمیدواری ہے
فروغِ ظلمتِ اہلِ ہوس کا دور گیا
سحر رُخانِ وفا اب تمہاری باری ہے

○

وہ جبر تھا کہ مرے خواب تک نہ تھے آزاد
مرے خیال کی تنہائیوں کو شکوہ تھا

وہ بے حسی تھی، وہ سنگین بے حسی کہ یہاں
دلوں کو اور دل آرائیوں کو شکوہ تھا
مرے سخن میں نہ تھی شوقِ دید کی مستی
ترے جمال کی رعنائیوں کو شکوہ تھا
مشاہداتِ حوادث میں مبتلا تھی نگاہ
تری ادا، تری انگڑائیوں کو شکوہ تھا
غمِ حیات میں پروائے دردِ دل بھی نہ تھی
تری وفا کی مسیحائیوں کو شکوہ تھا

○

ہوا ہے کار طلب سلسلہ اُمیدوں کا
ہمیں کبھی تو ملے گا صلہ اُمیدوں کا

○

نظر میں عکسِ فروغِ پسِ حجاب تو ہے
نہیں یہ خواب کی تعبیر، پھر بھی خواب تو ہے
حیات، سلسلہ جنبانِ آرزو تو ہوئی
نشاطِ شوق تو ہے، لطفِ اضطراب تو ہے
ہمارے نام سے آغازِ گفتگو تو ہوا
ادائے خاص تو ہے، لذتِ خطاب تو ہے

شکستگاں کے لبوں پر ہیں زخم زخم سوال
مگر یہ بات کہ اب مرہم جواب تو ہے
سراب سوختگاں سے میں اب نہیں مایوس
یہ کم نہیں ہے کہ احساسِ قحطِ آب تو ہے
فضائے حسنِ سماعت تو سازگار ہوئی
سو اب لبوں پہ یہاں ذکرِ انقلاب تو ہے

سچائیوں کے ساتھ

ذہن کا غم، ذات کا غم، ذات کے رشتوں کا غم
کتنے غم ہیں جو شعورِ زندگی کے ساتھ ہیں
اک مصیبت ہے، بلا ہے، آگہی کی روشنی
کس قدر تاریکیاں اس روشنی کے ساتھ ہیں

○

میں ہوں اک فن کار و شاعر اور میری زندگی
زندگی کے غم میں جلنے کے سوا کچھ بھی نہیں
ایک صحرا ہے مرا عہدِ جوانی اور مجھے
کام اس صحرا میں چلنے کے سوا کچھ بھی نہیں

○

میرا غم ہے میرے احساسات کی نیکی کا غم
میرے اِس صبر آزما غم نے جلا ڈالا مجھے
آج بھی حق سخت مشکل میں ہے اس احساس نے
عمر کی شاداب فصلوں میں بجھا ڈالا مجھے

○

چاٹتی ہے آج بھی انسانیت اپنا لہو
زندگی ہے آج بھی خود اپنے زخموں کا شمار
آج بھی قوموں کو دھمکاتا ہے قوموں کا غرور
ہے دلوں میں آج بھی تاریک صدیوں کا غبار

○

میں ہوں اس ملت کا شاعر جس کے حق میں سامراج
سازشوں کا زہر ہے' عیاروں کا وار ہے
دشمنی نے نام رکھ چھوڑا ہے اپنا دوستی
کس قدر قاتل یہ لطفِ نرمیِ گفتار ہے

○

حل نہ کرنے کے لیے ہر مسئلہ ہے زیرِ غور
مسئلوں کو اور اُلجھانے کا فن ہے سامراج
بستیاں ہیں مضطرب، آبادیاں ہیں مضمحل
بربطِ خود پروری پر زخمہ زن ہے سامراج

○

کتنے ہی غم ہیں جو ہم سودائیوں کے ساتھ ہیں
ہم جو حق کے ساتھ ہیں سچائیوں کے ساتھ ہیں

جون ایلیا کے دیگر شعری مجموعے

